اسلام کا شورائی نظام

Institute of Islamic Studies
15770
Panjab University Lahore.

مولینا جلال الدین انصر عمری

— مقدّمہ —

سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

— مرتّب —

اختر حجازی

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت ○ اردو بازار۔ لاہور۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

اسلام کا شورائی نظام

Institute of Islamic Studies
Panjab University Lahore.
15770

مولٰنا جلال الدین انصر عمری

مقدمہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتّب

اختر حجازی

مکتبہ تعمیرِ انسانیت ○ اردو بازار۔ لاہور ۲

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ

نام کتاب ——— اسلام کا شورائی نظام
مرتب ——— اختر حجازی
طابع ——— محمد سعید اللہ صدیق بن شیخ محمد قمر الدین
ناشر ——— مکتبہ تعمیر انسانیت ، اردو بازار ، لاہور
مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز
کتابت ——— محمد طیب رضا ، منصورہ ، لاہور
قیمت ——— ۱۵/- روپے

فہرست مضامین

عرضِ مرتب ۷
۱۔ حرفِ اوّل ۹
۲۔ مقدمہ ۱۳
باب اوّل ۱۹
۳۔ امیر اور آمریت ۲۱
۴۔ امیر کا تعطّل ۲۲
۵۔ امیر کی آزادی و پابندی ۲۲
۶۔ اسلام کی عمومیت ۲۳
۷۔ اجتماعی امور اور اُمّتِ مسلمہ ۲۷
۸۔ ترغیبِ شوریٰ ۳۰
۹۔ شوریٰ کی قانونی حیثیت ۳۴
۱۰۔ حکمِ شوریٰ اور رسول اللہؐ کی تعلیمات ۳۸
۱۱۔ شوریٰ اور امورِ سیاسی ۴۱
۱۲۔ اولوالامر کون ہیں؟ ۴۴
۱۳۔ اہلِ حل و عقد کے اختیارات ۵۰
۱۴۔ مشیروں کی ذمہ داریاں ۶۲
باب دوم ۶۹
۱۵۔ شورائی نظام تاریخ کی روشنی میں ۷۱
۱۶۔ جاہلیت کا شورائی نظام ۷۱

۱۷۔ قریش کا مقام ۷۴

۱۸۔ اسلام میں قریش کی حیثیت ۷۴

۱۹۔ اسلام میں انصار کا مقام ۷۶

۲۰۔ مہاجرین و انصار کی حیثیت ۷۷

۲۱۔ مہاجرین و انصار کی سیاسی پوزیشن ۸۰

۲۲۔ مرکز ریاست، مدینہ منورہ کی حیثیت ۸۲

۲۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شوریٰ ۸۵

۲۴۔ نمائندگانِ قبائل ۸۵

۲۵۔ چند مثالیں ۹۱

۲۶۔ (۱) واقعۂ بدر ۹۲

۲۷۔ (۲) میدانِ جنگ کا انتخاب ۹۳

۲۸۔ (۳) ابوالعاصؓ کا فدیہ ۹۴

۲۹۔ (۴) غزوۂ احد ۹۴

۳۰۔ (۵) جنگِ خندق ۹۶

۳۱۔ (۶) غزوۂ طائف ۹۸

۳۲۔ (۷) واقعۂ افک ۹۹

باب سوم ۱۰۲

۳۳۔ دورِ خلفائے راشدین میں شوریٰ کا نظام ۱۰۳

۳۴۔ انتخاب امیر ۱۰۸

۳۵۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ۱۱۰

۳۶۔ حضرت عمرؓ کی بیعت ۱۱۴

۳۷۔ حضرت عثمانؓ کی بیعت ۱۱۷

۳۸۔ حضرت علیؓ کی بیعت ۱۲۰

۳۹۔ مانعینِ زکوٰۃ سے قتال ۱۲۲

۴۰۔ جیشِ اسامہؓ ۱۲۴

۴۱۔ ارضِ سواد کی تقسیم ۱۲۶

۴۲۔ انسدادِ فتنہ کے لیے شوریٰ ۱۲۷

۴۳۔ اسلامی ریاست میں امیر کی حیثیت ۱۲۹

۴۴۔ جمع قرآن ۱۳۵

۴۵۔ لوطی کی سزا ۱۳۵

۴۶۔ امیر المومنین کا لقب ۱۳۶

۴۷۔ خلیفہ کی تنخواہ ۱۳۶

۴۸۔ عارضی زکوٰۃ ۱۳۷

۴۹۔ بیرونی اموال پر ٹیکس ۱۳۷

۵۰۔ غلاموں کی رہائی ۱۳۸

۵۱۔ شراب کی حد ۱۳۸

۵۲۔ تشریع اذان ۱۳۹

۵۳۔ تعریضاً قذف کی سزا ۱۳۹

۵۴۔ سنِ ہجری کا آغاز ۱۴۰

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (القرآن)

اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔

عرضِ مرتّب

ہر نظام کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں جن کی پابندی پر اس نظام کے قیام و بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کے بھی کچھ بنیادی اصول ہیں۔ جن میں سے شوریٰ (مشورہ کرنا) نظامِ اسلامی کا نہایت ہی اہم اصول ہے۔ آج کی جمہوریت پسند دنیا عوام کو حقوق دینے پر نازاں ہے کہ اس نے وہ عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ لیکن کیا اس دنیا کا یہ فخر مبنی بر حقیقت ہے؟ "اسلام کا شورائی نظام" اسی سوال کا جواب ہے۔

جناب سید جلال الدین انصر عمری صاحب کا یہ مقالہ ہم ماہنامہ "زندگی" رام پور کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں اور مقدمہ کے طور پر مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک تحریر بھی شامل ہے۔ اُمید ہے کہ اہلِ علم حضرات اس مجموعہ کو پسند فرمائیں گے۔

طالب دعا:
اختر حجازی

یکم نومبر ۱۹۸۳ء

حرفِ اوّل

اسلام کی داخلی قوت کی دو بنیادیں ہیں۔ عقائد میں عقیدۂ توحید و رسالت و آخرت، اور روزمرہ کی عملی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر شورائیت۔ انہیں دو قوتوں کے بل پر آغازِ اسلام میں مسلمانوں کی فکری یلغار کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا تھا۔ شیطان نے انہیں دونوں قوتوں کا شیرازہ بکھیرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر کے مسلمانوں کو انحطاط و جمود کا شکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ دینِ اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے اتارا گیا تھا اور اس کے تین بنیادی عقائد کو مستحکم طور پر دلوں میں پیوست کرنے کے لیے مکی زندگی کے ابتدائی تیرہ ۱۳ سال صرف کیے گئے تھے۔ توحید و رسالت اور آخرت، ایمان کی انہیں تین خالص اور بے آمیز بنیادوں نے صحابہ کرامؓ کو اپنے خون کے رشتوں کے خلاف بھی کشمکش کرنے، جرأت مندی سے انہیں برسرِ باطل ٹھہرانے اور ان کے ظلم و ستم کے خلاف ثابت قدمی اور استقامت دکھانے کی قوت و توانائی دی تھی۔ حضور اکرمؐ نے قریش کی ترغیب و ترہیب کے باوجود ان بنیادی عقائد پر ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی مصالحت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ انہیں خالص اور کھرے عقائد کے بل پر صحابہ کرامؓ اپنے گھر بار چھوڑ کر، ہجرت کر سکے تھے۔ کاروبار کی تباہی اموال کا نقصان اور عزیزوں کی جدائی انہیں عقائد کی قوت سے برداشت کر سکے تھے اور انہیں کے بل پر انہوں نے بدر و حنین کے معرکے کامیابی سے سر کیے تھے۔

مسلمانوں کی سربلندی اور عالمگیر قوتِ فتوحات کا راز انہیں عقائد کے خالص و بے آمیز ہونے پر تھا۔ وہ ہر کام خدا کے خوف سے لرزتے ہوئے اور اس کی کتاب کی روشنی میں کرتے اور آخرت کی جوابدہی کے شدید احساس کے تحت سر انجام دیتے تھے وہ رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو واحد ذریعۂ ہدایت سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے۔ بالآخر شیطان نے مسلمانوں کی قوت کے اس راز کو پا

لیا اور پھر اس نے انہیں عقائد کو اپنی نقب زنی کے لیے منتخب کیا۔

تصورِ توحید مختلف حیلوں اور وسیلوں سے مجروح کیا گیا اور ان وسیلوں نے امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہزاروں صورتیں اختیار کیں جن میں شرکِ خفی سے بات شروع ہو کر شرکِ جلی تک بات پہنچ گئی۔ اتباعِ رسالت کے تصور کو مشائخ و اکابر کے نام پر مجروح کیا گیا اور اس کے لیے بھی سنتِ نبویؐ سے انحراف کے حیلے بہانے نکل آئے۔ تصورِ آخرت اور اس میں جوابدہی کے کھلے کھلے احساس کو بھی شریعت کی پیروی سے بے نیاز، سفارش کے ذریعے بلا عمل نجات کی بے شمار صورتیں تجویز کر کے مجروح کر دیا گیا اور وہ مسلمان جو بدر و حنین کا مردِ مجاہد تھا بالآخر اس حیلۂ ابلیس کے ذریعے راندہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

وہ مردِ مومن جو اللہ کے رب ہونے پر راضی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی، اور دینِ اسلام کے دینِ حق ہونے پر راضی ہو کر دنیا کے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا تھا جو مردِ مومن انسانیت کو جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے جہاد کرتا تھا وہ ابلیس کی مکاریوں میں اُلجھ کر صرف مسلمان کہلانے کی بجائے شیعہ، سُنّی، دیوبندی، بریلوی، حنفی اور شافعی کہلانے پر فخر کرنے اور اپنے اس نئے انتساب کے لیے باہمی سر پھٹول کرنے لگا جس کے نتیجے میں وہ دینِ اسلام کی چہار دانگِ عالم میں تبلیغ کرنے کی بجائے باہمی ایک دوسرے کو ضال و مضل ثابت کرنے میں ہی اپنی علمی صلاحیتیں اور توانائیاں صَرف کرنے لگا۔ دَورِ حاضر کے مومن کی ان مصروفیات کو دیکھ کر ہی علامہ اقبال کے بقول ابلیس نے اپنی مجلسِ شوریٰ میں اس کے بارے میں اپنے مریدوں سے کہا تھا کہ: ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اور واقعی آج وہ انہیں مسائل میں اُلجھا ہوا ہے کہ: ؎

ابنِ آدم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے   ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے   یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریمؑ کے صفات

Ins dies
LIBR RY
15770
Punjab Lahore.

ہمیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم

یوں مسلمان اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد ترک کر کے ان مسائل کے لات و منات میں الجھ کر رہ گئے جن کا کوئی تعلق بھی اسلام کے نظامِ زندگی اور اس کے نفاذ کی تدابیر سے نہیں تھا۔ اعادۂ روح، سماعِ موتٰی، حیات النبیؐ، حیاتِ فی القبور، توسل و سفارش، مُردوں سے استفادہ، غرض بے شمار ایسے مسائل ایجاد کر لیے گئے جن کا کوئی تعلق بھی مسلمان کی عملی زندگی سے نہیں ہے اور نہ اسلام کی دعوت و اشاعت سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ ایسے مسائل یہودیوں کے دورِ انحطاط میں اُٹھے تھے۔ تو وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ گئے تھے اور مسلمان جب پستی میں گرے تو ان میں بھی ان مسائل نے ہی راہ پالی۔ یہ مسائل نہ ہمیں صحابہ کرامؓ کی معمول کی زندگی میں زیرِ بحث دکھائی دیتے ہیں اور نہ حضور پاکؐ نے انہیں اپنے دین کی اشاعت کی بنیاد بنایا تھا۔ یہ صرف طویل دورِ غلامی میں دین کے نکھرے ہوئے تصور سے بے بہرہ رہ جانے کے باعث پیدا ہوئے جب دورِ غلامی میں دین سکھانے کا نصاب مرتب ہوا۔ یہ سارے مسائل اسی نصاب کے پیدا کردہ ہیں۔ حضور اکرمؐ کے مدرسہ اصحابِ صفہ میں یہ مسائل کبھی بھی زیرِ بحث نہیں آئے تھے۔

یوں عقیدۂ توحید و رسالت و آخرت جو مسلمانوں کے لیے بے سروسامانی اور فاقہ مستی میں بھی قوت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا، مکمل طور پر غیر مؤثر ہو گیا اور مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہوئے بھی طاغوتوں اور کفار کے غلام بن گئے جہاں تک نظامِ مشاورت کا تعلق ہے تو ابھی ابتدائی تیس سال ہی گزرے تھے اور مشاورت کی روایت اپنی پختہ ہو کر کسی مخصوص ڈھانچے میں نہ ڈھلی تھی کہ بعض بزرگوں کے ہاتھوں خلافت ملوکیت سے بدل گئی اور اسلام کا سارا نظامِ مملکت شورائیت سے منتقل ہو کر ملوکیت اور جبریت میں بدل گیا۔ ظاہر ہے کہ ملوکیت اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ اس میں مشاورت کا اسلامی اصول کلیتہً منسوخ کر دیا گیا ہے اور ملک کی بادشاہت خدا کی بجائے جلالۃ الملک کی ہوتی ہے۔ چنانچہ پوری مملکتِ اسلامیہ میں خلفائے راشدین کے اتباع اور سنتِ نبویؐ کی پیروی کی بجائے قیصر و کسریٰ کی رسم ولی عہدی جاری ہو گئی۔ مشاورت کا اصول ختم ہوا اور پسندیدہ افراد کی طرف سے قصیدہ گوئی کا عمل شروع ہو گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جبریت، ملوکیت، استبداد اور مطلق العنانیت کا کوئی واسطہ اسلامی

نظامِ مملکت سے نہیں ہے۔ لیکن صدیوں سے مسلمانوں پر ایسے ہی جابر نظام مسلط رہے ہیں اور مسلمان عوام بیچارے بادشاہوں کی آمد و رفت کے صرف خاموش تماشائی بنے رہے ہیں انہیں کوئی عمل دخل ایسے حکام کی نشست و برخاست میں کبھی حاصل نہیں رہا ہے۔

اسلامی اجتماعیات کے اس صدی میں بہت بڑے ترجمان مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی یہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کے اصولِ مشاورت کو اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" اور "اسلامی ریاست" میں خوب کھول کھول کر بیان کیا ہے اور اسلام کا چہرہ صدیوں کے ملوکانہ گرد و غبار سے نکھار کر پیش کیا ہے ——— اختر حجازی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کافی محنت و کوشش سے اس موضوع کو سامنے رکھ کر مولانا سید جلال الدین انصر عمری کی نگارشات کو اس مجموعے میں جمع کیا ہے تاکہ اسلامی اجتماعیات کے طالب علم اور سکالرز اس سے استفادہ کر سکیں۔ ہم اس کاوش کے لیے انہیں مبارکباد دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی خدمات اور کاوشوں کو قبول فرمائے کہ انہوں نے اسلامی اجتماعیات کے اس اصولِ مشاورت کو پیش کر کے مسلمانوں کو شورائیت و جمہوریت کا راستہ دکھایا ہے۔ جس طرح توحید و رسالت و آخرت کے بغیر کسی اسلام کا تصور ممکن نہیں ہے اسی طرح نظامِ مشاورت کے اہتمام کے بغیر بھی کسی اسلامی نظامِ مملکت کا تصور ممکن نہیں ہے اور مولانا جلال الدین کا یہ مقالہ اس موضوع پر اگر حرفِ آخر نہیں تو حرفِ جامع ضرور ہے اور اہلِ علم ان کی اس کاوش سے ضرور مستفید ہوں گے۔

سید اسعد گیلانی

مقدمہ

مفکرِ اسلام سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

شُل

مشورہ کو اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے ، سورہ آل عمران میں مشورہ کا حکم دیا گیا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۱۵۹) اور اے نبیؐ! ان سے معاملات میں مشاورت کرو۔ یعنی ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو۔ اس بنا پر مشاورت اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا صرف جاہلیت کا طریقہ ہے، بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی؟ اس کے وجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں:

۱- ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اس میں ان سب کی رائے لی جائے اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتمد علیہ نمائندوں کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔

۲- دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے، اور نہ وہ متکبر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقلِ کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

۳- تیسرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک

بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جوابدہی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جرأتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی بازپرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو ان سب کو، یا ان کے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریکِ مشورہ کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے اور اگر نادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمہ داری نہ آ پڑے۔

یہ تین وجوہ ایسی ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بد اخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرزِ زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انہیں بھی شریکِ مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریکِ مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچائیت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کو چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحبِ رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابلِ اعتماد سمجھتی ہو اور وہ اسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم اسے خود اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہیئے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا، نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے نہیں بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اس نفس میں

پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے ملوث ہو، اور اس خواہش کے ساتھ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوشش صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا اور خلق کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو، حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علانیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔

اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انہیں اظہارِ رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور انہیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے جسے کوئی شخص اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھوئی ہوئی رضامندی درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیں اور اس طرح کے اظہارِ رائے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی نہ کہ اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاقِ رائے) سے دیا جائے، یا جسے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ ”ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے“ بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ ”ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں“۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اس کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اصولِ شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختارِ کل نہیں ہے بلکہ لازماً اس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے، اور اس اصل الاصول کی پابند ہے کہ ”تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے“۔ اور ”تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسول ؐ کی طرف رجوع کرو“۔ اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور اس پر عملدرآمد کس طریقہ سے کیا جائے تاکہ اس کا منشا ٹھیک طور پر پورا ہو، لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول ؐ نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔ (خ

باب اوّل

باب اوّل

اسلامی سیاست شورائیت

اسلامی سیاست کا ایک اہم باب اس کا شورائی نظام ہے، سیاسیاتِ اسلامی کی معراج و تکمیل شورائیت کے بغیر ناممکن ہے۔ شورائی نظام کو خارج کر دینے کے بعد اسلامی سیاست ایک تنِ بے روح اور گلِ بے بو کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

اسلام نے اپنی تمام تعلیمات کی طرح اس اہم پہلو کو بھی غیر مبہم اور صاف و صریح الفاظ میں واضح کر دیا تھا جس کے بعد اس مسئلہ میں کسی ریب و تردّد اور اختلاف کی گنجائش نہیں پیدا ہونی چاہیئے تھی لیکن دورِ حاضر کی ژولیدہ فکری نے اس واضح اور روشن مسئلہ کو بھی پیچیدگی اور الجھاؤ میں ڈال دیا ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ مسئلہ کے تمام گوشوں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تاکہ ایک آدمی کے ذہن میں کوئی ابہام اور غلط فہمی باقی نہ رہے اور حقیقت اپنی تمام جمال آرائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ بے نقاب ہو جائے۔

جو لوگ کسی بھی صورت سے اسلام میں شورائیت کو تسلیم کرتے ہیں ان کی تین ہی قسمیں ہو سکتی ہیں اور اس وقت ان تینوں ہی فکر و خیال کی مختلف طریقوں سے ترجمانی کی جا رہی ہے۔

۱۔ امیر اور آمریت :

ان میں سے ایک خیال تو وہ ہے جسے بعض اربابِ قلم نے ایک عرصہ سے پیش کرنا شروع کیا ہے کہ اسلامی مملکت کا صدر اپنے اختیارات و تصرفات کے لحاظ سے قریب قریب ایک ڈکٹیٹر کے مقام پر متمکن ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس پر جو کچھ حدود و قیود عائد کیے ہیں وہ اس قدر ادھورے اور ناقص ہیں کہ صدرِ ریاست ہوا و ہوس کی اتباع میں ہر طرح کی بدعنوانیوں کے لیے راہ نکال لے

سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابوجندل

سکتا ہے۔ اسلام صدرِ ریاست سے جو کچھ مطالبات کرتا ہے وہ بالاجمال یہ ہیں۔ امیر اساسات دین کی خلاف ورزی نہ کرے، "معروف" کو فروغ دے اور "منکر" کو ختم کرے، نیز مملکت کے کاموں میں اہل الرائے حضرات سے مشورہ کرے، لیکن اسلام امیرِ ریاست کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند نہیں کرتا اگر امیرِ مملکت، اربابِ شوریٰ سے بلا مشورہ کیے یا مشورہ کے بعد ان کے متفقہ فیصلہ کے علی الرغم کوئی اقدام کر جائے تو اسلام کے آئینِ سلطنت میں اس کے اس اقدام پر قدغن لگانے والی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے اور اگر وہ شوریٰ کے فیصلے کا خود کو پابند کر لے تو یہ اس کا کرم و احسان ہو گا۔

اسی طرح اگر کوئی صدر حدودِ اسلامی کی پامالی کرنے لگتا ہے اور اس کی بنیادوں کو متزلزل بھی کرتا ہے تو افرادِ مملکت کے پاس صدر کو اس کی اس غلط روی سے باز رکھنے کا سامان نہیں ہے کیونکہ اسلام نے اصلاح کے ہر اقدام پر فتنہ کا خوف و ہراس پیدا کر کے عوام کو بے دست و پا بنا دیا ہے جب عوام کو اپنے اختیارات سے عملاً بالکل اپاہج اور عضوِ معطل کر دیا جائے تو صدر سے اس کے اعمال کی باز پرس کون کر سکتا ہے۔

۲۔ امیر کا تعطّل :

اس کے بالکل برعکس اور متضاد ایک دوسری رائے ہے جس کے لحاظ سے ریاست کے ہر جزئی و کلی معاملہ میں فیصلہ کن طاقت شوریٰ ہی کی ہے اور امیر شوریٰ کے مشورہ کا بالکلیہ پابند ہے وہ شوریٰ کے فیصلوں سے سرِ مو تجاوز کرنے کا قطعاً مجاز نہیں ہے۔ اگر کسی وقت امیر اس قسم کا اقدام کر جائے تو شوریٰ کو اس کی برطرفی کا مکمل اختیار ہو گا۔

۳۔ امیر کی آزادی و پابندی :

اس سلسلہ کی تیسری رائے یہ ہے کہ امیر تمام اساسی امور میں نمائندگانِ قوم کی رائے کا پابند ہے اور اسے یہ حق نہیں ہے کہ ملک کے بنیادی اور فیصلہ کن معاملات کو اربابِ حل و عقد سے مشورہ لیے بغیر طے کر دے۔ ان تمام معاملات میں جو ریاست کے اجتماعی مفاد پر اثر انداز ہو سکتے ہیں قوم کے نمائندوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر صدرِ ریاست قدم اٹھانے کا حق ہی نہیں رکھتا۔ اگر کوئی امیر اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اربابِ بست و کشاد کو یہ حق ہے کہ وہ امیر کو معزول کر دیں۔ باقی

رہے روزمرہ کے امور تو ان میں امیر کو مسائلِ متعلقہ میں بصیرت اور درک رکھنے والوں سے مشورہ کرنا چاہیئے لیکن وہ ان مشیروں کی رائے کا پابند نہیں ہے۔ مختلف آرا میں سے کسی ایک رائے کے انتخاب اور اس پر عمل کا اسے حق ہے اور مشیروں کا یہ طبقہ ضروری نہیں ہے کہ قوم کے نمائندوں ہی پر مشتمل ہو بلکہ اس کے لیے صرف روزمرہ کے پیش آنے والے مسائل میں فہم و بصیرت سے بہرہ مند ہونا کافی ہے۔

یہی تیسری رائے ہماری دانست میں کتاب و سنّت کے موافق اور اس سے قریب تر ہے اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کا ہر قول قطعی اور ہر فیصلہ محکم اور غیر متبدل ہے اس کے ساتھ شارح قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و تشریحات کا مطالعہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کے نصوص کی اس سے زیادہ سچی اور صحیح تعبیر ممکن ہی نہیں اور یہی دو سرچشمے ہر اس شخص کی ہدایت کے ماخذ اور اس کے اختلافات کے حکم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی فرمانروائی پر کامل یقین رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں خالص تاریخی نقطۂ نظر سے اس امر کا بھی جائزہ لینا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے صادقین نے اجتماعی معاملات کو حل کرنے کی کیا صورت اختیار کی تھی۔ اگر کسی کی تعلیمات کی ایک سے زائد توجیہات ممکن ہیں لیکن اس کا عمل کسی ایک توجیہ کے حق میں مہرِ توثیق ثبت کر دیتا ہے تو پھر کسی کو یہ اختیار نہیں رہتا کہ اس کے الفاظ و تعبیرات کو کوئی خود تراشیدہ جامہ پہنائے۔

اسلام کی عمومیت:

نفسِ مسئلہ کا اس کے حقیقی خدوخال میں مطالعہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک اہم حقیقت ذہن نشین کر لی جائے اور وہ ہے اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیری، اس کی دعوت کے عموم میں نوعِ انسانی کا ہر وہ فرد شامل ہے جو اس فلکِ نیلگوں کے زیر سایہ رہتا بستا ہے، کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کی پکار سے انحراف کرے۔ کائناتِ ارض و سما جس قدر وسیع ہے اسی قدر اسلام کی دعوت بھی وسیع ہے۔ کیونکہ یہ دعوت کسی خاص خاندان اور کسی مخصوص خطہ کی اصلاح و تربیت کے لیے نہیں شروع کی گئی تھی بلکہ کائنات کے خالق و مالک نے اسے اپنے تمام بندوں کی فلاح و کامرانی اور نجات کا ذریعہ بنایا ہے[1] خدا کی قدرت اور

اس کی حاکمیت جس قدر عام اور بے پایاں ہے اسی قدر اس کا نازل کردہ دین بھی وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔

خدا کے سب سے آخری رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے اس نے اعلان کیا تھا:

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ
رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ
الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ
يُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ
النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ
يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ
اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ۝

(الاعراف: ع ۲۰)

اے نبی تم کہہ دو کہ اے لوگو! یقیناً
میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا
کر بھیجا گیا ہوں۔ وہ اللہ جس کے لیے
آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے
سوائے اس کے کوئی معبود نہیں
وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ پس
تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے
رسول پر جو نبی ہے اور اُمّی ہے اور
جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس
کی باتوں پر اور تم اس کی پیروی کرو
تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

اس کے ساتھ وہ اپنے ماننے والوں سے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ انہوں نے جس دین کو اپنا دستورِ عمل اور ضابطۂ حیات تسلیم کیا ہے اسے زندگی کے تمام گوشوں میں نافذ کریں۔ مسائلِ حیات کے حل کے لیے سوائے اس کے کسی اور طرف نگاہ تک نہ اٹھائیں، یہی ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے اس کے خلاف جو بھی روش وہ اختیار کریں مبنی بر نفاق اور اسلام کے خلاف ہوگی۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ
اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ

مومنین کو جب اللہ اور اس کے
رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ
وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو

يَقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا	ان کا کہنا بس یہی ہوتا ہے کہ ہم نے
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	سُنا اور اطاعت قبول کی اور
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ	ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں اور جو
رَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ	شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی
وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے
الْفَآئِزُوْنَ ۝	اور اس کا تقویٰ اختیار کرے ایسے
(النور : ع ۷)	ہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت کا قلادہ جس نے بھی زیب گردن کر لیا ہو اس کا تعلق خدا اور رسول سے ہو جائے خواہ وہ کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، یہاں نہ پنڈتوں کے کسی خاص گروہ کی اجارہ داری ہے اور نہ کسی آمر کی آمریت عوام کی گردنوں میں اپنا آہنی پنجہ گاڑے ہوئے ہے بلکہ یہاں صرف ایک ہی حاکم کی حاکمیت اور ایک ہی فرمانروا کی فرمانروائی جاری و نافذ ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی فرمانروائی کسی خدا کے بندے پر نافذ کی جائے گی۔ وہ جور و ستم اور ظلم و تعدی پر مبنی ہو گی۔ پس یہاں فرمانروائی اور حاکمیت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے اور عملاً وہ ہر اس شخص پر جاری ہو گی جو اللہ تعالےٰ کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، عربی ہو یا عجمی، اس کا رنگ سُرخ و سفید ہو کہ سیاہ، وہ اپنے کھیت میں ہل جوتتا ہو یا تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کیونکہ "خدا کی اطاعت" ایک اصول اور ایک ضابطہ ہے اور یہ بات آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ اصول کسی کی جاگیر نہیں ہوتے، ان پر کسی کی ٹھیکہ داری نہیں چلتی بلکہ ہر شخص کے لیے ان کا دامن وسیع ہوتا ہے، اصول کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک خانہ بدوش صحرائی یا آپ کے جوتے گانٹھنے والا ایک موچی بھی انہیں اپنائے تو اسے سردارانِ قوم کے دوش بدوش جگہ ملنی چاہیئے اور اگر وہ دینی فداکاریوں اور قربانیوں سے اصول کا سب سے زیادہ محافظ و پاسباں ثابت ہو اور میدانِ عمل میں دوسروں سے پیش پیش ہو تو رہنمائی کا عَلم تھامنے سے بھی اس کی راہ میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔

یہی حال اسلام کا بھی ہے وہ ایک ضابطۂ فکر وعمل ہے لہٰذا اس کے ہر ماننے والے کا فرض ہے کہ اپنی تمام توانائیوں کو اس کی پاسبانی و سربلندی کے لیے وقف کر دے اور کسی شخص کو اس کے حصار میں رخنہ اندازی کا موقع نہ دے خواہ اس راہ میں اسے اپنی جان و مال سے دستبردار ہو جانا ہی کیوں نہ پڑے، یہ رخنہ اندازی چاہے عبادات و اخلاق کے معاملہ میں ہو یا سیاسیات و معاملات میں، ہر قسم کی تحریف و تبدیل اور فساد و تغیر کی راہ روکنا ایک مسلمان کا فرض ہے کیونکہ یہ مسلمان کا اپنا نظامِ حیات اور دستور العمل ہے جس طرح کوئی شخص اپنی عزیز ترین متاع کی حفاظت و صیانت کی سعی کرتا ہے اسی طرح ہر مسلمان کے لیے اپنے اس جوہرِ بے بہا کی حفاظت کرنا لازم ہے۔

یہی اصولی فرق ایک شخصی اور جمہوری ریاست میں ہوتا ہے، شخصی حکومت سرتاسر ایک شخص کے فکر و خیال اور جذبات و میلانات کی تابع ہوتی ہے، اس کی فلاح و خسران اور کامیابی و ناکامی سے عوام کو سروکار نہیں ہوتا، اگر کسی نوع کا تعلق بھی ہوتا ہے تو وہ اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک کہ ان کے مفادات اس کے ساتھ وابستہ ہیں، برخلاف اس کے ایک اصولی اور عمومی ریاست میں ہر فرد اس سے براہِ راست متعلق ہوتا ہے، اس کی کامیابی و ناکامی کو اپنی کامیابی و ناکامی تصور کرتا ہے اور اس کے فروغ و سربلندی کی ہر سعی کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے اور اس کے زوال و تباہی کو کسی صورت دیکھ نہیں سکتا اور ہر ظالم کے پنجۂ ظلم کو موڑ دینے کے لیے وہ آگے بڑھتا ہے۔

اس حقیقت کو بار بار آپ اپنی چشمِ حق بیں کے روبرو لائیے اور غور کیجئے کہ اسلامی مملکت کس قدر جمہوری ہوگی؟ اس کے خطوطِ کار کس قدر عوامی ہوں گے؟ کیا ان بنیادوں پر تشکیل یافتہ اسٹیٹ میں آمریت و استبداد کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے؟ یہاں کا ادنیٰ خادم امیرِ ریاست کے ایک ایک عمل کے احتساب کا حقدار ہوگا اور امیر ملک کے ایک ایک باشندہ کے روبرو جوابدہ ہوگا۔ اگر امیر کسی بھی معاملہ میں جادۂ حق سے منحرف ہوگا تو قوم کا بچہ بچہ اس کا دامن پکڑ کر باز پرس کر سکتا ہے، جہاں جناب کی چشم و ابرو حاکم نہیں ہوں گے بلکہ یہاں خدائے ذوالجلال کی حاکمیت نافذ ہوگی جس

کے قائم و نافذ کرنے کا ہر پرستارِ حق ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً	اسی طرح ہم نے تمھیں درمیانی اُمّت
وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى	بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو
النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	اور رسول تم پر گواہ بنے۔
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ	(البقرہ: ع)

جس طرح یہ اُمّت اور اس کا ہر فرد ساری دنیا کے لیے منادِ حق اور خدا کے دین کا شاہد و علمبردار ہے بعینہٖ اسی طرح اگر حکومت کے قدم بھی راہِ صدق و امانت سے لغزش کھانے لگیں تو اس کا سنبھالنا اُمّت کا فرض ہے۔

اجتماعی امور اور اُمّتِ مُسلمہ :

(چونکہ اسلامی ریاست ایک عمومی اور جمہوری ریاست ہوتی ہے جو خالقِ ارض و سماء کے نازل کردہ دین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس لیے اجتماعی امور کے حل کرنے اور بنیادی معاملات کے فیصلہ کا حق کسی خاص فرد کے حوالے کرنے کے بجائے ساری اُمّت کے حوالے کیا گیا ہے۔

اسلامی سیاست کا یہ اصول اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اسے خاص اہمیت اور پوری شدّت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔]

سورۂ شوریٰ جو کہ ایک مکی سورت ہے اور جس میں خالص اصولی ہدایات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اسی سورت میں ایک مقام پر ان مومنین صادقین کی مدح و توصیف کی گئی ہے جن کے لیے آخرت کی کامیابی مقدر ہو چکی ہے۔ سلسلۂ بیان میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ وہ صادق الایمان اور اعلیٰ کردار سے آراستہ افراد ہیں جو خدا کے رسول کی دعوت کو بدل و جان قبول کرتے اور اپنی ساری عملی توانائیوں کو اس کی اتباع میں لگا دیتے ہیں۔ اس وصفِ کلی کے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں یعنی ان کا تعلق اپنے مولیٰ و آقا کے ساتھ حد درجہ پائیدار اور محکم ہوتا ہے، ان کی دوسری نمایاں ترین صفت یہ ہے کہ:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى	ان کے معاملات باہمی مشورے سے

بَيْنَهُمْ (ع ۴) طے پاتے ہیں۔

علامہ ابوبکر جصاص حنفیؒ فرماتے ہیں:

> "ایمان و اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ شوریٰ کا تذکرہ اس کی جلالتِ شان پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ مشورہ کرنے پر مامور اور اس کی پابند ہے۔"[1]

قرآن کا ایک عام طرز یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ فوراً زکوٰۃ یا انفاق کا تذکرہ کرتا ہے اور اس سے مقصود حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ایک سی اہمیّت اور ان کی غیر منفک حیثیت کو نمایاں کرتا ہوتا ہے۔ لیکن سورۂ شوریٰ کی مذکور الصدر آیت میں انفاق سے پہلے شوریٰ کا ذکر کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ شوریٰ کے اصول کو نظر انداز کر دینے کے بعد حقوق العباد کا تحفظ ناممکن ہے اور کوئی ریاست اس جوہر کے بغیر عدل و انصاف کے پاسنگ کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ یہاں ایک اور حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ حکمِ شوریٰ کو جملۂ اسمیہ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ مومنین کا یہ وصفِ امتیازی ایک دائمی وصف ہے جو کسی بھی حال میں ان سے منفک نہیں ہو سکتا، وہ کسی بھی وقت ایسا معاملہ طے نہیں کر سکتے جس میں باہمی مشورہ نہ کیا گیا ہو۔

امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> "صحابہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے رُوبرُو کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ جمع ہوتے اور مشورہ کے ذریعہ اسے طے کرتے۔ اللہ نے ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ وہ کسی معاملہ میں انفرادیت نہیں برتتے بلکہ اس کے برعکس جب تک کسی معاملہ پر ایک رائے نہیں ہو جاتے اقدام نہیں کرتے۔"[2]

احادیث ایک اور پہلو اس موقع پر ہمارے سامنے اُبھار کر لاتی ہیں وہ یہ کہ دنیا میں جتنی تباہیاں اور ہلاکتیں پیدا ہوئی ہیں ان سب کا سرچشمہ خواہشاتِ نفس اور اس

---

[1] احکام القرآن ج ۳ صـ ۴۷۵ [2] تفسیر کبیر ج ۷ صـ ۴۱۵

کے سفلہ جذبات کا اتباع ہے جب کوئی فرد یا قوم نفس کی بندگی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے تو اس کا تباہی و بربادی سے ہم کنار ہونا ناگزیر ہے لیکن جس قوم کے رگ و ریشہ میں خدا کی غلامی اور خوفِ آخرت جاگزیں ہو اس کے بعض افراد اور بعض طبیعتوں کے بارے میں تو یہ اندیشہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہو جائیں گے لیکن پوری امتِ مسلمہ کے بارے میں یہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی وقت وہ من حیث المجموع صداقت و راستی کی راہ سے پلٹ جائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالَۃٍ۔	میری امت کبھی ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

"انفرادی رائے سے اجتماعی رائے جو باہمی مشورہ سے طے پائی ہو زیادہ نافع ہے اس لیے کہ ایک فرد کا جذبات و خواہشات سے مغلوب ہو جانا عین ممکن ہے لیکن کسی جماعت کا ابتلائے ہوا و ہوس ہو جانا ناممکن ہے خصوصیت سے اعلیٰ مناصب اور شریعت کے بلند تر مراتب میں فرد کا ہوا و ہوس سے محفوظ رہنا دشوار تر ہے۔" [1]

ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تا قیامت میری اُمّت میں ایک ایسا طبقہ ضرور رہے گا جو دین کو ہر طرح کی تحریف و تغیّر سے محفوظ رکھے گا اور کسی فتنہ پرور کو فتنہ اندازی کا موقع نہ دے گا۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے اسی طبقہ کو حامیٔ دین اور اس کا مددگار قرار دیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

یہ اور اس قسم کی بہت ساری حدیثیں ہیں جن میں صاف صاف تصریح کی گئی ہے کہ

---

[1] الاعتصام ج ۳ صـ ۹۹

کسی بھی دَور میں اُمتِ مسلمہ کی دینی روح اس حد تک سرد نہیں پڑ جائے گی کہ پوری اُمتِ باطل کو انگیز کرنے لگے بلکہ کوئی نہ کوئی طبقہ ایسا ضرور موجود ہوگا جو ہر طرح کی رخنہ اندازیوں اور فتنہ سامانیوں کے مقابلہ میں سدِ راہ بنا رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے عوام کا کوئی گروہ یا جہلاء کی کوئی ٹولی مراد نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے ایسا ہی طبقہ مراد ہو سکتا ہے جس میں دین کی فہم و بصیرت ہو جو دین کے دشمنوں کی چالوں سے بخوبی واقف ہو، جو باطل کے ہر سوانگ اور روپ کو سمجھ سکتا ہو، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام نے حکومت و تنقید کا حق کیوں ساری امت کے حوالے کیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام کے ماننے والوں میں کسی ایک فرد یا کسی ایک جماعت کا راہِ صواب سے ہٹ جانا بہت ممکن ہے لیکن پوری اُمت کی اُمت باطل پرست ہو جائے، یہ ناممکن ہے۔

ترغیبِ شوریٰ :

اہمیت اور ضرورت

ان مقاصد کے پیشِ نظر اور جمہوریت کی اسپرٹ قائم رکھنے کے لیے شریعت نے پہلے ہی قدم پر انسان کے اندر باہمی مشورہ سے کام کرنے کا اشتیاق پیدا کیا ہے تاکہ دل کی گہرائیوں اور فکر و خیال کی پہنائیوں میں شورائیت کی رُوح جاری و ساری ہو جائے اور اس کے ہر کام میں اجتماعیت کی جلوہ گری ہوتی رہے اور انفرادیت و استبداد سے آدمی بالطبع نفرت کرنے لگے۔

(اسلام جس اجتماعی زندگی کو پیدا کرنا چاہتا ہے اور اپنے ماننے والوں میں جس قسم کے اتحاد و الفت کی کارفرمائی دیکھنا چاہتا ہے اس کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ شوریٰ پر پورا زور صرف کرتا، اخوت و الفت اور محبت و رافت کے نازک ترین رشتہ پر جو چیز قینچی چلاتی ہے وہ آدمی کی انفرادیت اور استبداد ہے۔ جب ایک آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرا اس کے حقوق کی پامالی کر رہا ہے اور اس کے "انا" اور خودداری کو مسل دینے کی سعی کر رہا ہے تو یک لخت اس کی رگِ حمیت و غیرت جاگ اٹھتی ہے اور اپنے آپ سے اہانت و ذلت کا داغ دھونے کے لیے وہ ہر بندش کو پارہ پارہ کر دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب معاشرہ کے افراد کے درمیان یہ تصور عام ہو جائے کہ یہاں کسی کی کسی پر حکمرانی نہیں ہے یہاں شاہ و گدا، خادم و

مخدوم، راعی و رعیت سب ایک صف میں کھڑے ہیں اور یہ معاشرہ الفت و محبت کے پائندہ اصولوں پر استوار ہے اور ہماری مرضی کے خلاف کوئی کام عملی جامہ نہیں پہن سکتا تو یہ یقینی ہے کہ فساد و بدامنی کا دروازہ از خود بند ہو جائے اور اُمت کا شیرازہ محکم سے محکم تر ہونے لگے۔

اہمیت از روئے حدیث

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا اسی حقیقت کی روشنی میں مطالعہ کیجیے۔

رَأْسُ الْعَقْلِ بَعْدَ الْإِيْمَانِ	ایمان کے بعد سب سے بڑی عقل مندی
التَّوَدُّدُ إِلَى النَّاسِ وَمَا يَسْتَغْنِيْ	لوگوں سے محبت ہے اور آدمی مشورہ
رَجُلٌ عَنْ مَشْوَرَةٍ ۔[1]	سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

ایک اور موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ کو اپنے لیے اچھے مشیر چننے کی ترغیب اور اس کے اچھے نتائج کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَبِيٍّ	اللہ تعالیٰ جب کوئی نبی بھیجتا ہے یا کسی کو
وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيْفَةٍ	خلیفہ بناتا ہے تو اس کے دو قسم کے
إِلَّا كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ	راز دار ہوتے ہیں کچھ تو وہ ہوتے ہیں
بِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْمَعْرُوْفِ	جو اسے بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور
وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ وَبِطَانَةٌ	اس پر آمادہ کرتے ہیں اور کچھ برائی کا
تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهُ	حکم دینے والے اور اس پر اکسانے
عَلَيْهِ وَالْمَعْصُوْمُ	والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ جس کو ان
مَنْ اللّٰهُ ۔[2]	برے مشیروں سے محفوظ کر لے اسی کو
	محفوظ سمجھنا چاہیے۔

شوریٰ کے بے شمار فوائد اور اس کے ناقابلِ تصور نتائج کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیل کے الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

اَلْمُشَاوَرَةُ حِصْنٌ مِنَ	مشورہ کرنا شرمندگی سے محفوظ رہنے کا

---

[1] سنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۱۰۹ [2] بخاری کتاب الاحکام باب بطانۃ الامام واہل مشورتہ، و دیگر کتب صحاح۔

اَلنَّدَامَۃِ وَ اَمَانٌ مِنَ الْمَلَامَۃِ۔ [1]	ایک قلعہ ہے اور ملامت سے بچنے کی ایک اماں گاہ ہے۔

آپؐ کا ایک حکیمانہ قول ہے:

مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ۔ [2]	وہ آدمی ناکام نہیں ہوا جس نے استخارہ کیا اور اس شخص کو شرمندگی اٹھانی نہیں پڑی جس نے مشورے سے کام لیا۔

حضور اکرمؐ نے اُمّت کو یہ تعلیم دی ہے:

اِسْتَعِيْنُوْا عَلٰى اُمُوْرِكُمْ بِالْمُشَاوَرَةِ۔ [3]	اپنے کاموں میں باہمی مشورے سے مدد حاصل کرو۔

امام ابوداؤد نے اپنی "مراسیل" میں روایت کی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "حزم" یعنی احتیاط اور مضبوطی کار کسے کہتے ہیں۔ آپؐ نے جواب دیا "اَنْ تُشَاوِرَ ذَا رَأْيٍ ثُمَّ تُطِيْعَہٗ" یہ کہ تم صاحبِ رائے سے مشورہ کرو اور اس کے مشورہ کی پابندی کرو۔ [4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ شوریٰ کے ذریعہ طے کردہ معاملات کے استحکام اور استواری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"ایک شخص کی رائے اکہرے اور کچے دھاگے کی سی ہے جب دو رائیں کسی مسئلہ پر جمع ہوجاتی ہیں تو ان کی نوعیت دو مضبوط دھاگوں کی سی ہوجاتی ہے۔ جب کسی معاملہ میں تین رائیں متفق ہوجاتی ہیں تو وہ ناقابلِ شکست ہوجاتی ہیں"۔ [5]

حضرت عمرؓ کا ایک اور ارشاد ہے:

"دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کے کام کرنے کے ڈھنگ بھی جدا جدا ہوتے

---

[1] المدخل لابن الحاج المتوفی ۷۳۷ھ ج ۴ ص ۴۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] بیہقی ج ۱۰ ص ۱۱۲ [5] عیون الاخبار ج ۱ ص ۳۱۔

ہیں ایک تو وہ شخص جو معاملات کا اپنی جیسی کچھ رائے ہوتی ہے اسی کے مطابق فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جو مشکلات میں مشورہ کرتا ہے اور اہل الرائے کے مشورہ کے مطابق عمل کرتا ہے تیسرا وہ شخص جو مشکلات میں حیران و سرگرداں رہتا ہے نہ تو سیدھے طریقہ پر اپنے معاملہ کو حل کر سکتا ہے نہ کسی کی بات مان کر اس پر عمل کرتا ہے۔"[1] (ان میں سے کس کا عمل درستی پر ہے یہ از خود واضح ہے)

حضرت علیؓ کا ایک قول ہے:

"مشورہ آدمی کا بہترین معاون ہے، بُری ہے وہ طاقت جس سے آدمی استبداد پر اُتر آئے۔"[2]

حضرت علیؓ ہی کا ایک دوسرا قول ہے:

اَلْاِسْتِشَارَۃُ عَیْنُ الْھِدَایَۃِ وَقَدْ خَطَرَ مَنِ اسْتَغْنٰی بِرَاْیِہٖ۔[3]	باہمی مشورہ سے کام کرنا ہی اصل ہدایت ہے وہ شخص خطرات میں گھر گیا جس نے اپنی رائے کے ساتھ انفرادیت اختیار کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے:

"ایک دوسرے سے مشورہ کرنا اور آپس میں علمی مذاکرہ کرنا خیر و برکت کی کلید اور رحمت کے دروازے ہیں کیونکہ ان دونوں کے اختیار کرنے کے بعد کسی رائے کے بھٹک جانے اور حزم و احتیاط کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ نہیں ہے۔"[4]

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

وَاللّٰہِ مَا اسْتَشَارَ قَوْمٌ قَطُّ اِلَّا ھُدُوْا لِاَفْضَلِ مَا	قسم بخدا جب کوئی قوم آپس میں مشورہ کرتی ہے تو پیش آمدہ مسائل میں

---

[1] المدخل لابن الحاج ج ۴ ص ۱۴۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] ایضاً

بِعَضَائِهِمْ [1] راہِ صواب پالیتی ہے۔

شورٰی کی قانونی حیثیت :

یہ ترغیبات و تشویقات خود اس بات کے لیے کافی ہیں کہ ایک مومن والہانہ طور پر اپنے اجتماعی معاملات کو باہمی مشورے کے ذریعے سرانجام دے اور انفرادیت کی لعنت سے بالکلیہ دامن کش رہے، لیکن شریعت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے قانونی گوشوں کو بھی بغیر کسی ابہام کے دُنیا کے سامنے رکھ دیا، اب ایک آنکھ رکھنے والا شخص اسلام کی ان آفتاب سے زیادہ واضح تصریحات کا انکار نہیں کرسکتا۔ الا یہ کہ کوئی اپنی آنکھیں ہی بیچ لے۔

شورائی نظام کی قانونی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایک منٹ کے لیے رک کر اس تشریح کو دوبارہ ملاحظہ فرمالیں جو آیت شورٰی کے تحت کی گئی ہے۔ اس آیت نے دو ٹوک فیصلہ کردیا کہ اُمت اپنے معاملات کا فیصلہ باہمی مشورے کے ذریعے طے کرے گی۔

ہمارے علم میں کتاب وسنت میں کوئی ایسی تصریح نہیں ملتی جسے ہم اس حکمِ صریح کی ناسخ قرار دیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی تعلیمات اور سیرت مویدہ اسی اجمال کی تفصیل دکھائی دیتی ہے۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبہ میں اعلان کیا:

فَاِذَا رَاَيْتُمُوْنِيْ قَدِ	جب تم مجھے دیکھو کہ میں سیدھے
اسْتَقَمْتُ فَاتَّبِعُوْنِيْ	راستہ پر چل رہا ہوں تو میری اتباع
وَاِنْ زِغْتُ	کرو اور اگر میں راہِ راست سے ہٹ
فَقَوِّمُوْنِيْ۔ [1]	جاؤں تو مجھے ٹھیک کردو۔

اس سے مسئلہ کی تمام اُلجھنیں صاف ہوگئیں اور یہ بات از خود واضح ہوگئی کہ اسلام کی نگاہ میں اصل قوت عوام ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جب تک یہ محسوس کریں گے کہ ہمارا رہنما ہماری صحیح قیادت کر رہا ہے اس وقت تک اس کے دست و بازو بنے رہیں گے لیکن جس وقت

---

[1] الادب المفرد للامام البخاری ص۵۳۔

ان کی آنکھیں دیکھنے لگیں گی کہ اب قیادت بجائے کعبہ کے ترکستان کی طرف لے جارہی ہے اقتدار کی کنجیاں اس کے ہاتھ سے چھین لیں گے۔

یہ تصریح صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہیں کی ہے بلکہ اسی کے ہم معنی بیانات تمام خلفائے راشدین سے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔

شوریٰ کا دوسرا حکم سورۂ آلِ عمران میں نازل ہوا جو مدینہ منورہ میں جنگِ اُحد کے بعد اُتری تھی، اس آیت کی پوری پوری اہمیت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ نزولِ آیت کا پس منظر بھی سامنے رہے۔

جنگِ اُحد کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ ہی میں رہ کر دشمن سے مقابلہ کرنے کی تھی لیکن جمہور صحابہ خارجِ مدینہ میدانِ کارزار میں مشرکین سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے، آپؐ نے حکمِ قرآنی کے مطابق جمہور کی رائے پر عمل کیا اور مدینہ سے میدانِ جنگ کی طرف نکل پڑے، بعد ازاں میدانِ اُحد میں گھسان کا رن پڑا اور علمِ فتح و نصرت حق پرستوں کے ہاتھ میں رہا اندریں اثنا بعض جاں نثاروں کی غلط فہمی سے جنگ کا پانسا پلٹ گیا اور جیتا ہوا میدان ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ ایسا نازک موقع تھا جب کہ بہت ممکن تھا کہ جمہور کی فکر و رائے کی عظمت کچھ فروتر ہو جاتی اور ان کی رائے اور مشورہ کی قدر و قیمت ایک گونہ کم ہو جاتی۔ فوراً ارشادِ خداوندی نے توجہ دلائی۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ (آلِ عمران: ع ۱۷)	اے نبی پس انہیں معاف کیجئے اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کیجئے اور ان سے معاملات میں مشورہ کرتے رہیئے اور جب آپؐ (مشورہ کے بعد) کسی کام کا عزم کر لیں تو خدا پر توکل فرمائیے۔ (اور اقدام فرمائیے)

اس آیت نے بتایا کہ گو جمہور نے غلطی کی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ ان کی رائے مبنی بر خطا ہی ہو جمہورِ امت ریاست کا سرمایہ اور جان ہیں انہیں نظر انداز کر کے کوئی قدم نہیں

اٹھایا جا سکتا، اگر کسی فرد نے استبداد سے کام لیا اور اس کے نتیجہ میں ساری اُمّت کو مصیبت اٹھانا پڑی تو یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی لیکن اُمّت کا فیصلہ اگر غلط بھی نکلے تو اس کے لیے قابلِ برداشت ہوتا ہے اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ ساری قوم غلط راہ ہی کا تعین کرے۔

اس آیت کے مخاطب براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ظاہر ہے کہ نبی کے قلب و رُوح پر ہر آن غیب کا فیضان ہوتا رہتا ہے اُس کے بارے میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت راہِ راست سے (نعوذ باللہ) منحرف ہو سکتا ہے، اسی طرح دنیوی معاملات میں بھی بیشتر مواقع پر آسمانی ہدایت جادۂ صواب کی طرف رہنمائی کرتی رہی اور زندگی کے نشیب و فراز میں کامیابی و ناکامی کے گُر بتاتی رہی جہاں تک فکرِ انسانی کی رسائی ممکن نہیں لیکن اس کے باوجود چونکہ نبی کی ذات ایک قابلِ تقلید اسوہ اور واجب الاتباع راہنما کے مقام پر فائز ہوتی ہے اس لیے حکمِ شوریٰ کی طرف دوبارہ توجہ دلائی گئی تاکہ آپ کے جانشین کسی بھی حال میں اس حکمِ قطعی کو نظر انداز نہ کرنے پائیں۔

حضرت حسن بصریؒ نے آیت زیرِ بحث کو اسی روشنی میں دیکھا ہے، فرماتے ہیں:

> "خدا کو معلوم تھا کہ نبی صحابہ کے مشورہ کا محتاج نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مشورہ کا حکم دیا گیا تاکہ اُمّت اپنے معاملات کو اسی نہج پر حل کرے"۔[1]

قرآن کے مشہور قانون دان امام ابوبکر جصاص حنفیؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی اس حکم کو واجب مانتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

> "یہ بات صحیح نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ کرنے کا حکم محض تطییبِ نفوس یا صحابہ کے مراتب کو بلند کرنے یا سُنّتِ مشاورت قائم کرنے کے لیے دیا گیا ہو کیونکہ اگر صحابہ کو یہ بات معلوم ہوتی کہ مشورہ طلب معاملات

---

[1] کتاب الام للامام الشافعیؒ ج ۷ ص۸۶، بیہقی ج ۱۰ ص۱۰۹، فتح الباری ج ۱۳ بحوالہ ابنِ ابی حاتم۔

میں اپنی بساط بھر کوشش کرنے کے باوجود ان کے مشورہ کو شرفِ قبولیت نہیں عطا کیا جائے گا۔ اور ان کے مشوروں کے مطابق عمل درآمد نہیں ہوگا تو اس میں ان کی رفع شان تو کیا ہوتی اس طرزِ عمل سے اُلٹا سخت متوحش ہوتے اور یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے کہ ہمارے مشوروں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔" (اور یہ بات ان کی ذلت کی باعث بنتی)

علامہ سید محمودؒ آلوسی بغدادی کو امام ابوبکر جصاص حنفیؒ کے طرزِ استدلال سے اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں:

" اگر مشورہ کا مقصد اربابِ شوریٰ کی آراء سے فائدہ اٹھانے کی بجائے محض دلجوئی ہوتا تو ہر کس و ناکس سے مشورہ لیا جاسکتا تھا خواہ وہ صاحبِ رائے ہو یا نہ ہو، (حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اہل الرائے سے مشورہ فرماتے تھے۔")[2]

بہرحال نبیؐ کے حق میں اس مشورہ کی جو بھی حیثیت ہو، اُمّت پر اس حکم کے واجب ہونے سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔

علامہ ابوحیان اندلسیؒ اس حکم کا منشا واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَتَشْرِيعُ الْمُشَاوَرَةِ لِمَنْ بَعْدَهُ وَالِاسْتِظْهَارُ بِرَأْيِهِمْ ۔ [3]	بعد کے لوگوں کے لیے مشاورت کو قانونی حیثیت دے دینا اور اہل الرائے کی آراء سے مستفید ہونا ہے۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

" اس آیت میں مشورہ کرنے اور معاملات کو سربستہ رکھنے اور ان پر ہر پہلو سے غور و فکر کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی تصریح کردی گئی کہ مشاورت شریعت میں مطلوب ہے اور یہ حکم بعض سردارانِ عرب کی مستبدانہ روش کے

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۴۹ [2] روح المعانی ج ۴ ص ۱۰۷

[3] البحر المحیط ج ۳ ص ۹۸ ۔

بالکل برعکس ہے کہ وہ معاملات کے نشیب و فراز پر غور و فکر اور مشورہ کیے بغیر حکم نافذ کر دیا کرتے تھے۔" [1]

اسلامی تمدن کا مشہور مؤرخ محمد بن طبا طبائیؒ کہتا ہے:

"ہمارے نزدیک اس آیت کی صحیح توجیہ اور حقیقت سے قریب تر رائے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم اس لیے دیا گیا تاکہ اُمّت آپؐ کی اقتداء میں شوریٰ کی پابندی کر سکے۔" [2]

حکمِ شوریٰ اور آنحضرتؐ کی تعلیمات:

زیرِ بحث آیت کی ضمنی تحقیقات کے بعد آیئے شارحِ قرآن کی اس سلسلہ کی ہدایات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ شوریٰ کے اعتبار سے [illegible] کے سامنے [illegible]

(زندگی کے تمام معاملات میں احادیث ایک بنیادی ضابطہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، آپؐ کا فرمانِ مبارک ہے:

كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ۔ [3]	ہر وہ کام جس پر ہماری جانب سے کوئی دلیل نہ ہو وہ مردود ہے۔

اس حکم کے ذریعہ جب شریعت عوام مسلمین کو یہ حق دے چکی ہے کہ وہ تمام معاملات جو کتاب و سنت کی اساس پر قائم نہ ہوں وہ قابلِ رد ہیں اور اُمّت انہیں کسی بھی صورت سے تسلیم نہیں کرے گی تو ایسی صورت میں ایک امیر کے لیے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ اپنے تمام اہم اقدامات میں عوام یا ان کے قابلِ اعتماد نمائندوں کو مطمئن کرے کہ اس کا قدم جادۂ شریعت سے منحرف نہیں ہوا ہے اور تاآنکہ قوم اس کے دلائل پر مطمئن نہ ہو جائے وہ کسی کام کو عملی شکل نہ دے)

یہی حقیقت ہے جسے شوریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے تحت امیر پیش آمدہ

---

[1] البحر المحیط ج ۳ ص ۹۹ [2] الفخری ص ۱۷ [3] بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ۔

مسائل کو اربابِ حل وعقد کے رُوبرُو ان کے غور وفکر کے لیے رکھتا ہے تاکہ راہِ حق و صواب متعین ہو جائے اور زیرِ بحث معاملہ ایک فرد کی رائے سے متجاوز ہو کر ایک قوم کی رائے کی شکل اختیار کر لے۔

علامہ ابنِ عبد البرؒ (المتوفی ۴۶۳ھ) نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ہمارے بیان کی پوری پوری تائید ہوتی ہے اور اس حدیث کی اصل مسند امام احمدؒ میں بھی موجود ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ قَالَ اِنَّمَا الْاُمُوْرُ ثَلَاثَۃٌ اَمْرٌ تَبَیَّنَ لَکَ رُشْدُہٗ فَاتَّبِعْہُ وَاَمْرٌ تَبَیَّنَ لَکَ غَیُّہٗ فَاجْتَنِبْہُ وَاَمْرٌ اخْتُلِفَ فِیْہِ فَکِلْہُ اِلٰی عَالِمِہٖ۔ [1]

ابنِ عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ معاملات تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ تم پر اس کے سلسلہ میں راہِ صواب واضح ہو گئی پس اس کی اتباع کرو، ایک وہ کہ اس کی ضلالت تم پر کھل گئی پس اس سے اجتناب کرو، ایک وہ جس کے ہدایت یا ضلالت ہونے میں اختلاف ہو اسے اس کے جاننے والے کے حوالے کر دو۔

اس حدیث کا حکم جس طرح افرادِ اُمت کے حق میں عام ہے اسی طرح اس کے عموم میں رہبرانِ اُمت بھی شامل ہیں، اس عموم سے انہیں مستثنٰی کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

مَا عَلَّمَکَ اللّٰہُ فِیْ کِتَابِکَ فَاحْمَدِ اللّٰہَ وَمَا اسْتَأْثَرَ بِہٖ عَلَیْکَ مِنْ عِلْمٍ

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا جو علم تمہیں دیا ہے اس پر اللہ کی تعریف کرو اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں دیا گیا،

---

[1] مختصر جامع بیان العلم وفضلہ ص۱۰۶

فَكِلْهُ إِلَىٰ عَالِمِهٖ وَلَا تَتَكَلَّفْ ۔ [۱]	اسے اس کے جاننے والے کے حوالے کر دو ۔

مذکورہ بالا احادیث اور عبد اللہ بن مسعودؓ کے اس قول سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جس معاملہ میں کتاب و سنّت کا واضح حکم نہ ہو وہاں عمل اس شخص کے قول کے مطابق ہو گا جو متعلقہ مسئلہ میں کتاب و سنّت میں گہری بصیرت رکھتا ہو، شوریٰ کا بھی منشا مقصود ہے ۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں :

إِذَا قَضَى الْحَاكِمُ بِجَوْرٍ أَوْ خِلَافَ أَهْلِ الْعِلْمِ فَهُوَ رَدٌّ ۔ [۲]	جب حاکم ظلم سے یا اہلِ علم کے خلاف کوئی فیصلہ کرے تو وہ فیصلہ قابلِ ردّ ہو گا ۔

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس "الجماعت" کے اتباع کا حکم دیا ہے اور جس سے خروج دین سے خروج کے مترادف بنایا گیا ہے، "وہ اہلِ علم کی جماعت ہے"۔ [۳]

مشہور تابعی ابو الاسود دؤلیؒ فرماتے ہیں :

اَلْمُلُوْكُ حُكَّامٌ عَلَى النَّاسِ وَ الْعُلَمَاءُ حُكَّامٌ عَلَى الْمُلُوْكِ ۔ [۴]	بادشاہ لوگوں پر حاکم ہیں اور علماء بادشاہوں پر ۔

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

إِنَّ أَعْمَالَ الْأُمَرَاءِ مَوْقُوْفَةٌ عَلَىٰ فَتَاوَى الْعُلَمَاءِ وَ الْعُلَمَاءُ فِي الْحَقِيْقَةِ أُمَرَاءُ الْأُمَرَاءِ ۔ [۵]	امراء کے اعمال علماء کے فتاویٰ پر موقوف ہیں ۔ علماء درحقیقت امراء کے بھی امراء ہیں ۔

اس ساری بحث کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے ایک باب میں سمیٹ لیا ہے ،

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۴ [۲] بخاری کتاب الاحکام [۳] بخاری کتاب الاعتصام

[۴] تذکرۃ السامع والمتکلم للقاضی بدر الدین المتوفی ۳۳ھ ص ۱۰ ، [۵] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۵۹

فرماتے ہیں :

"بَابُ مَاجَاءَ فِی اجْتِهَادِ الْقُضَاةِ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی لِقَوْلِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ وَمَدَحَ النَّبِیُّ صَاحِبَ الْحِكْمَةِ حِيْنَ يَقْضِیْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا وَلَا يَتَكَلَّفُ مِنْ قِبَلِهٖ وَمُشَاوَرَةِ الْخُلَفَاءِ وَسُؤَالِهِمْ اَهْلَ الْعِلْمِ" [1]

امام بخاریؒ کے باب سے تین اصول ہمارے سامنے آئے ہیں۔

۱۔ نصوص کی عدم موجودگی میں قاضی اجتہاد سے کام لے گا۔

۲۔ لیکن یہ اجتہاد کتاب وسنت کے اصول پر مبنی ہو گا اس سے آزاد نہ ہو گا، کیونکہ نصِ قرآنی کے مطابق جو شخص خدا کی ہدایت کے تحت فیصلہ نہ کرے وہ ظالم ہے۔ ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صاحبِ حکمت کی مدح و توصیف کی ہے جو اپنی حکمت سے احکامِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور جس بات کا علم نہ ہو اس میں خواہ مخواہ تکلّف نہیں کرتا۔

۳۔ تیسرا اصول یہ کہ خلفاء کو پیش آمدہ مسائل میں اہلِ علم سے مشورہ کرنا چاہیئے اور ان سے نوعیّتِ مسئلہ جان کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔

شوریٰ اور امورِ سیاسی :

اس بحث کا تعلق ان امور سے ہے جن میں اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑتی ہے اور جن میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ہمارا قول وعمل نصوصِ صحیحہ کے خلاف نہ پڑ جائے لیکن وہ معاملات جنہیں آج کل کی اصطلاح میں خالص سیاسی معاملات کہا جاتا ہے ایک اسلامی ریاست کی ان کے سلسلہ میں کیا روش ہو گی اسے بھی احادیث اور علمائے امّت نے بالکل نکھار کر رکھ دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وفعل من حیث النبی ہمارے لیے حجت اور سند

---

[1] بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

ہے لیکن دنیوی معاملات میں اور ان مسائل میں جن کا تعلق نبوت سے نہ ہو، آپ کا کیا مقام ہے اس کی تصریح خود آپؐ نے فرمادی ہے۔ عرب میں کھجور کے درختوں میں پیوند لگانے کا طریقہ عام تھا آپؐ نے جب اسے دیکھا تو فرمایا کہ ایسے نہ کیا جائے تو بہتر ہوگا، صحابہ نے ارشاد کی تعمیل میں پیوند لگانا ترک کر دیا جس کے نتیجہ میں اگلے سال فصل گھٹ گئی حضورؐ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا:

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ	مَیں تو ایک آدمی ہوں، جب میں تمھیں
بِشَيْءٍ مِنْ دِيْنِكُمْ	تمھارے دین کے متعلق کوئی بات
فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا	بتاؤں تو اسے لے لو لیکن جب میں
اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ	اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو ایسی
مِّنْ رَّاْيِيْ فَاِنَّمَا	صورت میں میری حیثیت صرف ایک
اَنَا بَشَرٌ۔ لہ	آدمی کی سی ہے۔

یہ حدیث گو ایک خاص موقع و محل میں وارد ہوئی ہے لیکن اس سے ایک اصولِ کلّی مستنبط ہوتا ہے کہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق براہِ راست کتاب و سنت سے نہ ہو اور جن کی انجام دہی کا فریضہ پوری اُمّت کے سر عائد ہوتا ہو، امیر یا خلیفہ کی حیثیت اس کے طے کرنے میں ایک ریاست کے عام فرد کی ہوجاتی ہے، اس کے لیے یہ اختیار ہی نہیں ہے کہ اپنی رائے کو قانونی شکل میں اُمّت پر ٹھونسے، یہ بات صرف مجملاً نہیں رکھی گئی بلکہ قرآن و حدیث کے واضح بیانات نے مسئلہ کا حقیقی رُخ متعین کر دیا ہے۔

ہماری مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مسلمانوں کے معاملات ان کے باہمی مشورہ ہی سے آخری شکل اختیار کریں گے، اس مقام پر پہنچ کر از خود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُمّت کا ہر فرد اجتماعی معاملات میں براہِ راست دخیل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن العمل صورت ہے اس طرح نہ کوئی معاملہ طے پا سکتا ہے اور نہ فلاح و ترقی کی راہ میں کوئی قدم اٹھایا

لہ صحیح مسلم، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکر الخ مسند احمد حدیث نمبر ۱۳۰۹۹

جا سکتا ہے اس لیے کہ قومی و ملّی مسائل میں ہر شخص رائے دینے کا اہل نہیں ہوتا نیز زندگی کے بے شمار مسائل میں ہر فرد کی رائے حاصل کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی زندگی میں بعض ایسے مسائل بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن میں ہر فرد قوم سے رائے لینی پڑتی ہے گو کہ آج دنیا جمہوریت کی دعویدار بنتے اور نت نئے وسائل و ذرائع کی مالک ہونے کے باوجود اس مقصد میں کماحقہٗ کامیاب نہیں ہوئی ہے، بنیادی اور قوم کی قسمت کے فیصلہ کن معاملات میں بھی اگر کسی ملک کی دس فیصد آبادی حصہ لیتی ہے تو اسے بہت بڑی کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے معاملات میں اگر ہر شخص سے رائے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اسلامی رُوح سے قریب تر ہوگی لیکن عام معاملات میں شریعت نے ایک ایسی ممکن العمل اور خالص جمہوری صورت امت کے سامنے رکھ دی ہے کہ جہاں تک ہزار سعی و جہد کے باوجود آج کی متمدن دنیا کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔

کتاب و سنت نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت دی ہے کہ اس قسم کے تمام معاملات میں ارباب حل و عقد اور اُمت پر اثر و رسوخ رکھنے والا اور معتمد طبقہ سر جوڑ کر بیٹھے اور فلاحِ اُمت کی راہ تجویز کرے اور ساری اُمت اس نمائندہ گروہ کے احکام کے رُوبرُو سرِ تسلیم خم کر دے اور عمل کے لیے کمربستہ ہو جائے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت
أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ	ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحابِ
تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ	امر ہیں، اگر تم کسی معاملہ میں تنازعہ کرنے
إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ	لگو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف
كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	لوٹا دو اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان
الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ	رکھتے ہو۔ یہ طریقہ بہتر اور عمدہ ہے
تَأْوِيْلًا ○ (النساء: ع ۸)	انجام کے لحاظ سے۔

اس آیت میں تین قسم کی اطاعتیں اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں پر فرض کی گئی ہیں

خدا کی اطاعت، اس کے رسول کی اطاعت اور "صاحبانِ امر" کی اطاعت، ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ فیصلہ کن قوت اس گروہ کے من مانے فیصلے نہیں ہوں گے، بلا قید اور بے چون و چرا اطاعت صرف خدا اور اس کے رسول کی ہو گی، کتاب و سنت ہی وہ آخری معیار ہیں جن کے رُو برُو ہر ایک کو جبینِ نیاز خم کر دینی پڑے گی۔

اولوالامر کون ہیں ؟ :

" اولوالامر" سے کونسا طبقہ مراد ہے اس کی تشریح اسی سورت کے دوسرے مقام پر کر دی گئی ہے چنانچہ منافقین کے سلسلہ میں ارشاد ہوا کہ ان کی فتنہ جوئی اور بدنیتی کا یہ حال ہے کہ ملک کے اندر امن و امان اور چین و سکون کی آمد آمد ہو یا کسی خارجی خطرے اور خوف و بدامنی کا اندیشہ، یہ بدطینت اس خبر کو اس طرح نشر کرتے ہیں کہ عوام یا تو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو جاتے ہیں اور حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے یا پریشانی و سراسیمگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان پر خوف و ہراس کے بادل منڈلا سکتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے صحیح روش یہ تھی کہ وہ معاملات کو اللہ کے رسول اور اس طبقہ کے حوالہ کر دیتے جنہیں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے اور حالات کا صحیح جائزہ لینے کی صلاحیت حاصل ہے۔

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِنَ الْاَمْنِ	اور جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا ہے
اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ	امن یا خوف کا تو یہ اسے پھیلا دیتے
اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي	ہیں اور اگر یہ اسے رسول اور اصحابِ
الْاَمْرِ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ	امر کی طرف لوٹاتے تو ان میں جو اہلِ
يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔	استنباط ہیں وہ اسے سمجھتے (اور
(النساء: ع ۱۱)	اس کے مناسب عملی اقدام کرتے)

یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ غیر معمولی اور نازک حالات میں بیک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور "اولی الامر" کی طرف مراجعت کا حکم دیا جا رہا ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ "اولی الامر" انتظامیہ سے متعلق طبقہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ طبقہ ہے جو اپنی دُور بیں نگاہ، اور حقیقت آشنا فہم سے معاملات کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے جس کے اندر مسائل کے

مالہ وما علیہ سے واقف ہونے کی صلاحیت ہے اور جو اُمّت کے لیے فلاح وبہبود کی راہ تجویز کر سکتا ہے۔

ابن خویز منداد کہتے ہیں:

"اگر کسی حاکم کو دین کے کسی مسئلہ کا صحیح علم نہ ہو یا اور کوئی پیچیدگی پیدا ہوجائے تو اس کے لیے علماء کی طرف رجوع کرنا واجب ہے، اسی طرح معاملاتِ جنگ میں قائدین، دُنیوی امور میں اکابرِ قوم اور شہروں کی آبادکاری اور ان کی صلاح وفلاح کے سلسلہ میں وزراء اور گورنروں کی طرف مراجعت ضروری ہے۔"[1]

شیخ محمد عبدہؒ مصری فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک عرصہ تک "اولوالامر" کی حقیقت پر غور کیا بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "اولوالامر" سے مراد مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد ہیں۔ "اولوالامر" کا دائرہ علماء، امراء، حکام، رؤسائے جنود، اکابرینِ قوم اور تمام راہنماؤں پر وسیع ہے جن کی طرف اُمّت اپنی ضروریات اور مصالح میں رجوع کرتی ہے، اگر اُمّت کا یہ طبقہ کسی معاملہ پر متفق ہوجائے تو اُمّت پر اس کی اطاعت واجب ہوگی بشرطیکہ "اولوالامر" مسلمانوں ہی میں سے ہوں اور ان کا حکم کتاب وسُنّت کے خلاف نہ پڑتا ہو اور اپنی بحث اور فیصلہ میں کسی دباؤ سے مجبور نہ ہوں، ساتھ ہی ان کے اجتہاد کا دائرہ مصالحِ مومنین تک محدود ہو۔[2]

چونکہ اسلامی اسٹیٹ خالص دینی اسٹیٹ ہوگی اور اس میں جس معاملہ پر بھی غور وخوض ہوگا دین ہی کے تحت ہوگا اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ہر کام کی اساس کتاب وسنت کی ہدایات پر قائم ہو اس لیے بعض آئمہ تفسیر نے "اولوالامر" کا مصداق طبقۂ علماء کو قرار دیا ہے۔ اور یہ رائے اپنی جگہ پر بہت حد تک مبنی بر حقیقت ہے کیونکہ اسلامی ریاست کے اربابِ بست وکشاد حالاتِ وقت کے نبّاض ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب وسُنّت میں گہری بصیرت رکھنے والے اور اس کے واقف کار ہوں گے۔

احادیث نے ان مجملات کو تفصیل کے ساتھ واضح سے واضح تر کردیا ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۲۴۹

[2] تفسیر المنار ج ۵ ص ۱۸۱

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی اس آیت "فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (جب تم کسی بات کا فیصلہ کر لو تو خدا پر اعتماد کرو ــــ اور آگے بڑھو) کا مطلب دریافت کیا گیا کہ کیا یہ "عزم" امیر اپنی صوابدید کے مطابق کرے گا یا اہل الرائے کے مشورہ کے مطابق؟ آپؐ نے جواب دیا "اِسْتِشَارَةُ اَهْلِ الرَّأْيِ ثُمَّ اِتِّبَاعُهُمْ" یعنی اہل الرائے سے مشورہ کیا جائے مشورہ کے بعد حیص بیص کی ضرورت نہیں بلکہ کارساز حقیقی پر تکیہ کیا جائے اور مشورہ کے مطابق عمل کیا جائے۔[1]

[illegible]

حضرت علیؓ ہی سے ایک دوسری روایت ہے:

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ عَرَضَ لِيْ اَمْرٌ لَمْ يَنْزِلْ فِيْهِ قَضَاءٌ فِيْ اَمْرِهٖ وَلَا سُنَّةٌ كَيْفَ تَاْمُرُنِيْ؟ قَالَ تَجْعَلُوْنَهٗ شُوْرٰى بَيْنَ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعَابِدِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا تَقْضِ بِرَاْيِكَ خَاصَّةً۔[2]

حضرت علیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میرے رُوبرو کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے بارے میں نہ تو کوئی فیصلہ نازل ہوا ہو اور نہ ہی کوئی سُنّت۔ ایسی صورت میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں، آپؐ نے فرمایا، تم لوگ اس معاملہ کو دین کی سمجھ رکھنے والے اور خدا ترس مومنوں کی شوریٰ کے حوالے کر دو اور تم اپنی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

پہلی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مثبت جواب دیا تھا کہ اہل الرائے سے مشورہ کیا جائے اور ان کے مشورہ کی پابندی کی جائے، دوسری روایت نے اثبات و نفی

---

[1] تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن مردویہ ج ۱ صہ ۴۲۰

[2] رواہ الطبرانی فی الاوسط۔

دونوں پہلوؤں کو جمع کر دیا ہے یہاں آپؐ نے صریح الفاظ میں بتا دیا کہ اسلام میں آمریت اور استبداد کے لیے سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ شریعت کا واجب الاتباع حکم یہ ہے اور جس سے کوئی ایسا نظام جو اسلامی نہج پر استوار ہو، سرِ مُو اختلاف نہیں کر سکتا کہ ان تمام مسائل کو جن کے بارے میں کتاب و سُنّت خاموش ہوں خدا ترس اور ارباب فہم و بصیرت کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ خدا کے خوف اور احساسِ ذمہ داری کے تحت معاملہ کا صحیح رُخ متعین کر سکیں ۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مسائل کے حل کا طریقہ دریافت کیا گیا جن میں کتاب و سُنّت کوئی واضح راہنمائی نہ دیتے ہوں آپؐ نے جواب دیا "يَنْظُرُ فِيْهِ الْعَابِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" عبادت گزار اور تقویٰ شعار اہلِ ایمان اس پر غور کریں گے ۔ [1] [illegible]

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا :

وَلْيَكُنِ الْإِبْرَامُ بَعْدَ التَّشَاوُرِ	قطعی فیصلہ مشورہ کے بعد ہونا چاہیئے
وَالصَّفْقَةُ بَعْدَ طُوْلِ	اور طویل مباحثہ کے بعد کسی بات کو
التَّنَاظُرِ ۔ [2]	آخری شکل دینی چاہیئے ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاضی شریحؒ سے فرماتے ہیں :

اِقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ لَكَ	اللہ کی کتاب سے جو تمہیں راہنمائی حاصل
مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ	ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو اگر تمہیں
لَمْ تَعْلَمْ كُلَّ كِتَابِ اللّٰهِ	پوری کتاب اللہ کا علم نہیں ہے تو نبی
فَاقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ	صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ معلوم ہو تو
لَكَ مِنْ قَضَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ	اس کے مطابق فیصلہ کرو ۔ اگر رسول اللہ
فَاِنْ لَمْ تَعْلَمْ كُلَّ قَضَاءِ	کے فیصلہ سے بھی آگاہی نہ ہو تو ہدایت
رَسُوْلِ اللّٰهِ فَاقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ	یافتہ آئمہ کے طریقے کے مطابق فیصلہ کرو

---

[1] سنن دارمی باب التورع عن الجواب فی مالیس فی کتاب ولا سنة ص ۲۸ ، [2] عیون الاخبار ج ۴ ص ۲۳۳

لك من الائمة المهتدين فان لم	اگر تمھیں آئمہ مہتدین کے سب فیصلوں
تعلم كل ما قضت به الائمة المهتدين	کا علم نہیں ہے تو خود اجتہاد کرو اور اہل
فاجتهد رأيك واستشر اهل العلم والصلاح [1]	علم اور اصحابِ صلاح سے مشورہ کرو۔

اس سلسلہ میں قاضی دمشق اور حضرت عمرؓ کی ایک گفتگو نقل کرنا بھی بے حد مفید ہو گا۔

حضرت عمرؓ: فیصلہ کس طرح کرتے ہو؟

قاضی دمشق: کتاب اللہ کے مطابق۔

حضرت عمرؓ: اگر کسی مسئلہ کا حل کتاب اللہ میں نہ ملے تو کیا کرتے ہو؟

قاضی دمشق: سنتِ رسول اللہ کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ: اگر نبیؐ کی سنت میں بھی راہنمائی نہ ملے تو پھر کیا صورت اختیار کرتے ہو؟

قاضی دمشق: اجتہاد کرتا ہوں اور اپنے ہم نشینوں سے مشورہ کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ: بہت خوب۔ [2]

سلمہ بن مخلدؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے کہا کہ ہمیں محکمۂ قضا کے لیے مجبور کیا گیا ہے، بتایئے کن بنیادوں پر فیصلہ کیا جائے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے جواب دیا "کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو، اگر کتاب اللہ میں حل نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کرو، اگر سنت میں بھی کوئی جواب نہ ملے تو اہل الرائے حضرات کو بلاؤ اور ان سے مشورہ کر کے فیصلہ دو۔" [3]

مشہور تابعی عروہؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے دریافت کیا کہ فیصلہ کیسے کیا جائے، جواب دیا:

ان رأس القضاء	قضا کا بہترین طریقہ کتاب اللہ کی اتباع
اتباع ما في كتاب الله	ہے پھر سنتِ رسولؐ کے مطابق فیصلہ
ثم القضاء بسنة رسول	کرنا پھر آئمہ ہدیٰ کے نظائر کے مطابق

---

[1] کنز العمال ج ۳ ص ۱۷۴، اعلام الموقعین [2] کنز العمال ج ۳ ص ۱۷۴،

[3] السنن الکبریٰ ج ۱۰ ص ۱۲۵۔

اللہِ ثُمَّ بِحُکْمِ اَئِمَّۃِ الْھُدٰی	کرنا ہے اگر یہاں بھی مسئلہ حل نہ ہو
ثُمَّ اسْتِشَارَۃُ ذَوِی الْعِلْمِ	تو اصحابِ علم ورائی سے مشورہ کے
وَالرَّأْیِ ۔ [1]	بعد فیصلہ کرنا چاہیئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ نے تمام علاقوں میں یہ حکم نافذ کردیا تھا کہ ہر مقام کے لوگوں کو وہاں کے فقہاء کی متفقہ رائے کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ [2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عمرو بن العاصؓ کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:

”میں نے خالد بن ولیدؓ کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ تمہاری اعانت کے لیے پہنچ جائیں، جب وہ تمہارے پاس آجائیں تو ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور اپنی رفعتِ شان اور تفوق کا مظاہرہ نہ کرو، خالد بن ولیدؓ اور دیگر اصحاب پر تمہیں امیر مقرر کردینے کی وجہ سے ان کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرو اور کسی معاملہ میں ان کی مخالفت نہ کرو۔“ [3]

ایک اور خط میں عمرو بن العاصؓ ہی کو لکھتے ہیں:

”جنگی معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مشورہ کیا کرتے تھے تم بھی اس طریقہ کی پابندی کرو۔“ [4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھتے ہیں:

”طلحہ اور عمرو بن معدی کرب سے جنگی کاموں میں مشورہ کرتے رہو۔“ [5]

ان تصریحات کے بعد ایک دو ارشاداتِ نبوی بھی سُن لیجئے جن سے اسلامی نظامِ شورائیت کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے، ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تین قسم کے لوگ سب سے پہلے جہنم میں جائیں گے جن میں سے

---

[1] مختصر جامع بیان العلم وفضلہ ص ۱۰۵ [2] دارمی ص ۸۰ باب اختلاف الفقہاء،

[3] کنز العمال ج ۳ ص ۱۳۳، [4] کنز العمال ج ۲ ص ۱۶۳،

[5] السنن الکبرٰی ج ۱۰ ص ۱۱۳۔

ایک "امیر مسلط"[1] ہے یعنی غالب و قاہر جو اُمّت کی رضا کے بغیر مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے اور اپنی من مانی کرنے لگے۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

شِرَارُ اُمَّتِی مَنْ یَلِی الْقَضَاءَ اِنِ اشْتَبَہَ عَلَیْہِ لَمْ لَمْ یُشَاوِرْ الخ[2]

میری اُمّت کا بدترین شخص وہ ہے جو منصبِ قضا پر متمکن تو ہو لیکن مشتبہ معاملات میں مشورہ نہ کرتا ہو۔

اہلِ حل و عقد کے اختیارات:

مذکورہ بالا سطور میں پیش کردہ تفصیل کے بعد اس حقیقت کے پانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اسلام کے نزدیک کتاب و سنت کی حدود میں عمومی اختیار پوری اُمّت کو حاصل ہے اور نمائندگانِ اُمّت درحقیقت اسی عمومی اختیار کے امین اور محافظ ہوتے ہیں۔ ان کا یہ فرضِ منصبی ہوتا ہے کہ پوری اُمّت کے جذبات و میلانات کا حتی طور پر پاس و لحاظ رکھیں اور ان کے رجحانات کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں ورنہ ان کا حقِ نمائندگی ختم ہو جائے گا۔ دوسری طرف پوری اُمّت کو ان کے سیرت و کردار پر اس قدر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ ان کے کسی فیصلہ کو بلا کسی معقول وجہ کے رد نہیں کر دیتی بھی نہیں بلکہ جب تک اُمّت کے پاس کوئی قطعی دلیل عقلی یا نقلی نہ ہو وہ اس فہم و بصیرت رکھنے والے اور معاملات کا صحیح جائزہ لینے کی استعداد رکھنے والے طبقہ کی مخالفت نہیں کر سکتی ایسی صورت میں اُمّت پر واجب ہے کہ اربابِ حل و عقد کے احکام کی بے چون و چرا پیروی کرے۔ فقہاء کی اصطلاح میں جسے اجماع کیا جاتا ہے اس میں یہی ہوتا ہے کہ اُمّت کے علماء کسی فیصلہ پر متحد ہو جاتے ہیں اور وہ فیصلہ ساری اُمّت کے لیے واجب القبول ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس پہلو سے غایت درجہ حکمت ملحوظ رکھی ہے، آج کل عالمِ سیاسیات میں جو اختلافات، ہنگامے اور عوام اور اربابِ اقتدار کے درمیان جو دائمی کشمکش بپا رہتی ہے

---

[1] الترغیب والترہیب بحوالہ ابنِ حبان صـ۵۰۰

[2] کنز العمال ج ۳ صـ۲۰۶

اس کے دفعیہ کی اس سے بہتر صورت ممکن نہیں کہ ایک طرف عوام سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے میں سے قابلِ اعتماد اور باصلاحیت افراد کو اپنا نمائندہ مقرر کریں اور جن کی بے نفسی وحسنِ سیرت پر انہیں کامل بھروسہ ہو انہیں اپنا ترجمان سمجھیں۔ دوسری طرف ان سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ جس معاملہ پر یہ نمائندے متفق ہو جائیں جب تک تمہارے پاس کوئی برہان قاطع موجود نہ ہو ان کی بے لوثی اور اعلیٰ ترین صلاحیت پر بلا وجہ شک وشبہ نہ کیا جائے اور ان کے فیصلوں کو قبول کر لیا جائے۔

اس بحث کو ٹھیک سمجھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو تین ارشادات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ صدر اوّل میں اس کی کونسی تعبیر مراد لی گئی اور اس سلسلہ میں عملی پالیسی کیا رہی پھر یہ کہ بعد کے مستند علماء محققین نے اس کی کیا تشریح کی۔

عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ	حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ
لَوْ کُنْتُ مُؤَمِّرًا اَحَدًا دُوْنَ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
مَشُوْرَۃِ الْمُؤْمِنِیْنَ لَاَمَّرْتُ	اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے امیر بناتا
اِبْنَ اُمِّ عَبْدٍ۔ [1]	تو عبداللہ بن مسعودؓ کو بناتا۔

یہ حدیث اس بحث میں فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں ایک شخص خلافت کا مستحق ہے لیکن وہ اپنی رائے کو اس لیے عملی جامہ نہیں پہناتا کہ اس سے شورائیت کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے اگر شورائیت ختم ہو گئی تو نظامِ اسلامی کا وہ ستون گر گیا کہ جس کے بعد عمارت کے منہدم ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔

یہی وجہ ہے جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اُمّت کا بہترین فرد اور خلافت کا سب سے زیادہ مستحق جاننے اور مرض الموت میں تک اس کی فکر رکھنے کے باوجود کبھی نامزد نہیں کیا۔

---

[1] مسند احمد حدیث نمبر ٥٦٦، ترمذی، حاکم، امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن دیگر طرق سے اس کی سند مضبوط ہے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ مَنْ یُؤَمَّرُ بَعْدَكَ ؟ آپؐ کے بعد کسے امیر بنایا جائے؟ آپؐ نے جواب دیا۔ " اگر تم ابوبکرؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے دُنیا سے بے نیاز اور آخرت کی طرف راغب پاؤ گے، اگر عمرؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے ایک قوی ترین شخص، امانت دار اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کی پروا نہ کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم علیؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے ہدایت یافتہ، ہدایت کی طرف راہنمائی کرنے والا پاؤ گے، وہ تمہیں صراطِ مستقیم پر لے چلے گا، لیکن میرا خیال ہے کہ تم اسے امیر نہیں بناؤ گے۔"[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کا ذاتی رجحان خلافت کے سلسلہ میں مذکورہ بالا بزرگوں کی طرف تھا لیکن آپؐ نے انہیں خلیفہ مقرر نہیں کیا بلکہ صرف اپنی ذاتی رائے کے اظہار پر اکتفا کیا۔ حضرت علیؓ کے بارے میں آپ کو معلوم تھا کہ اُمّت آپ کی خلافت پر متفق نہیں ہو گی اور اس کا اتفاق کرنا بہتر ہے لیکن اس کے باوجود آپؐ نے حضرت علیؓ کو خلافت کے لیے نامزد نہیں کیا اور نہ ہی اُمّت کو اس کا حکم دیا تاکہ شورائیت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اس قسم کے فیصلے اُمّت کے اربابِ حل وعقد ہی کیا کرتے تھے اور اُمّت اسے بے چون وچرا قبول کر لیتی تھی۔

انتخابِ خلیفہ ہی کا مسئلہ لیجئے چاروں خلفاءؓ کے انتخاب کی یہی صورت رہی ہے کہ اُمّت کے اربابِ بست وکشاد نے کسی کے انتخاب پر اتفاق کر لیا اور اُمّت اس پر متفق ہو گئی لیکن جیسا کہ ہم نے کہا یہ طبقہ اُمّت کے میلانات کو نظر انداز کر کے کسی کو خلیفہ نہیں منتخب کرتا تھا۔

علامہ ماوردیؒ انتخابِ خلیفہ کی صورت اس طرح پیش کرتے ہیں:

فَاِذَا اجْتَمَعَ اَهْلُ الْعَقْدِ	جب اہلِ حل وعقد امیر کے انتخاب
وَالْحَلِّ لِلْاِخْتِیَارِ	کے لیے جمع ہوں گے تو ان اشخاص
اَحْوَالَ اَهْلِ الْاِمَامَةِ الْمَوْجُوْدَةِ	کے حالات پر غور کریں گے جن میں
فِیْهِمْ شُرُوْطُهَا فَقَدَّمُوْا	امامت کی شرطیں پائی جاتی ہیں اور

---

[1] مسند احمد حدیث نمبر ۸۵۹ طبرانی اوسط، بزار۔

لِلْبَيْعَةِ مِنْهُمْ اَكْثَرَهُمْ
فَضْلًا وَاَكْمَلَهُمْ شُرُوْطًا
وَمَنْ يُسْرِعُ النَّاسُ
اِلٰى طَاعَتِهٖ وَلَا يَتَوَقَّفُوْنَ
عَنْ بَيْعَتِهٖ فَاِذَا تَعَيَّنَ
لَهُمْ مِنْ بَيْنِ
الْجَمَاعَةِ مَنْ اَدَّا
هُمُ الْاِجْتِهَادُ اِلٰى
اِخْتِيَارِهٖ عَرَضُوْهَا
عَلَيْهِ فَاِنْ اَجَابَ اِلَيْهَا
بَايَعُوْهُ عَلَيْهَا وَانْعَقَدَتْ
بَيْعَتُهُمْ لَهٗ فَلَزِمَ
كَافَّةَ الْاُمَّةِ
الدُّخُوْلُ فِيْ بَيْعَتِهٖ
وَالْاِنْقِيَادُ لِطَاعَتِهٖ ۔[1]

وہ بیعت کے لیے اس شخص کو
آگے بڑھائیں گے جو ان میں سب
سے افضل ہو اور جس میں امامت
کے شرائط بدرجۂ اتم پائی جاتی ہوں
اور یہ کہ لوگ کس کی اطاعت کی طرف
تیز گامی دکھائیں گے اور اس کی بیعت
کے لیے پس و پیش نہیں کریں گے
اور جب ان کی تحقیق و اجتہاد ان
میں سے کسی ایک کو چن لے تو منصب
امامت اس شخص کے سامنے پیش
کریں گے اور اگر وہ اسے قبول کر لے
تو وہ سب اس کے ہاتھ پر بیعت
کریں گے اور ان کی بیعت اس شخص
کے لیے منعقد ہو جائے گی اور ساری
اُمّت کو اس بیعت میں داخل ہونا اور
اس کی اطاعت قبول کرنا لازم ہو جائیگا۔

اس باڈی کو چونکہ پوری قوم کا اعتماد حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے فیصلہ کے بعد کسی شخص کو اس کے رَدّ کا استحقاق نہیں رہتا اور ایسا شخص خارج "عن الجماعۃ" سمجھا جائے گا۔

مشہور محدث ابن بطال کہتے ہیں:

اَلْمُرَادُ بِالْجَمَاعَةِ اَهْلُ الْحَلِّ   "الجماعۃ" سے مراد ہر دور کے اہلِ

---

[1] الاحکام السلطانیہ صہ ۵ ۔

وَالْعُقَدِ مِنْ كُلِّ عَصْرٍ ۔ [1]

حل و عقد ہیں ۔

محدث کرمانیؒ فرماتے ہیں :

مُقْتَضَى الْأَمْرِ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ إِنَّهُ يَلْزَمُ الْمُكَلَّفَ مُتَابَعَةُ مَا يُجْمِعُ عَلَيْهِ الْمُجْتَهِدُونَ ۔ [2]

التزام جماعت کے حکم کا منشا یہ ہے کہ آدمی کو مجتہدین کے متفقہ فیصلہ کی اتباع کرنا لازمی ہے ۔

امام ابن تیمیہؒ کو اس بات کی شکایت ہے کہ لوگ "اجماع" کا مفہوم سمجھے بغیر غیر مجمع علیہ مسائل پر اجماع کا حکم صادر کر دیتے ہیں لیکن جب کسی مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو اس کی کیا حقیقت ہو جاتی ہے اسے خود امام موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے ۔

مَعْنَى الْإِجْمَاعِ أَنْ يَجْتَمِعَ عُلَمَاءُ الْمُسْلِمِينَ عَلَى حُكْمٍ مِنَ الْأَحْكَامِ لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ أَنْ يَخْرُجَ عَنْ إِجْمَاعِهِمْ فَإِنَّ الْأُمَّةَ لَا تَجْتَمِعُ عَلَى ضَلَالَةٍ ۔ [3]

اجماع کا معنیٰ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اہل علم کسی حکم پر متفق ہو جائیں اور جب کسی حکم پر امّت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ان کے اجماع سے باہر نکل جائے ۔ کیونکہ امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی ۔

یہی وجہ ہے کہ جب اہل حل و عقد حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو آپ نے اسے پوری اُمّت کی بیعت کے ہم معنی تصور کیا اور امیر معاویہؓ کے اختلاف کو باغیانہ اختلاف سمجھ کر ان سے جنگ کی ۔

حضرت عمرؓ کا ایک فرمان ہے " لَا خِلَافَةَ إِلَّا عَنْ مَشُورَةٍ [4] " خلافت مشورہ کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتی ۔

---

[1] فتح الباری ج ۱۳ صـ ۲۴۵ ، [2] ایضاً [3] فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۱ صـ ۴۰۶

[4] کنز العمال ج ۳ صـ ۱۳۹ ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک مرتبہ فرماتے ہیں تین باتیں ہیں جنہیں ذہن نشین کر لو ان میں سے ایک ہے " اَلْاِمَارَۃُ شُوْرٰی[1] " امارت شورٰی کے ذریعہ طے پائیگی۔

حضرت عمرؓ اپنے ایک طویل خطاب میں فرماتے ہیں:

" اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ہاتھ پر مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر بیعت کرے گا تو نہ اس کی بیعت کا کوئی اعتبار کیا جائے گا اور نہ اس شخص کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے جس کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ ہاں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں دونوں کی گردنیں نہ اڑا دی جائیں۔"[2]

حضرت عمرؓ ہی کا ایک قول ہے:

مَنْ دَعَا اِلٰی اِمَارَۃِ نَفْسِہٖ	جو شخص اہل حل و عقد کے مشورہ کے
اَوْغَیْرِہٖ مِنْ غَیْرِ مَشْوْرَۃٍ	بغیر خود امیر بننے یا دوسرے کو امیر
فَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ	بنانے کی دعوت دے تو تمہیں لامحالہ
لَّا تَقْتُلُوْہُ ۔[3]	اسے قتل کر دینا چاہیئے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے خلافت کے معاملہ کو جن چھ اشخاص کی کمیٹی کے حوالہ کیا تھا کہ باہمی مشورہ سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں، اس کمیٹی سے خطاب کر کے فرماتے ہیں:

فَمَنْ تَاَمَّرَ مِنْکُمْ عَلٰی	تم میں سے جو شخص مسلمانوں کے مشورہ
غَیْرِ مَشْوْرَۃٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ	کے بغیر امیر بن جائے تو اس کی گردن
فَاضْرِبُوْا عُنُقَہٗ ۔[4]	قلم کر دو۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علیؓ سے خلافت کی پیشکش کی تو آپؓ نے جواب دیا۔ یہ کام روا روی اور جلد بازی میں طے کرنے کا نہیں ہے، حضرت عمرؓ

یہ تو اہل مشورہ اور اہل بدر کے کرنے کا کام ہے

---

[1] کنز العمال ج ۳ صہ ۱۵۸ [2] بخاری، باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت، مسند احمد حدیث نمبر ۳۹۱، [3] کنز العمال ج ۳ صہ ۱۶۷، [4] طبقات ابن سعد القسم الاوّل ج ۳ صہ ۲۴۹، ۲۵۰

[illegible]

کی متعین کردہ شوریٰ موجود ہے وہ باہمی مشورہ سے کسی کو امیر منتخب کرے گی"۔ [1]

ابن قتیبہؒ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ زیادہ صاف اور واضح ہیں:

لَيْسَ ذٰلِكَ اِلَيْكُمْ اِنَّمَا هُوَ لِاَهْلِ الشُّوْرٰى وَاَهْلِ بَدْرٍ فَمَنْ رَضِيَ بِهٖ اَهْلُ الشُّوْرٰى وَاَهْلُ بَدْرٍ فَهُوَ الْخَلِيْفَةُ فَنَجْتَمِعُ وَنَنْظُرُ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ [2]	انتخاب امیر تمہارا کام نہیں۔ یہ اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا حق ہے جس شخص پر اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر متفق ہو جائیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔

اس وقت حضرت زبیرؓ نے جو تقریر کی ہے اسے ابن قتیبہؒ نے ان الفاظ میں محفوظ کیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ رَضِيَ لَكُمُ الشُّوْرٰى فَاَذْهَبَ بِهِ الْهَوٰى وَقَدْ تَشَاوَرْنَا وَرَضِيْنَا عَلِيًّا فَبَايِعُوْهُ۔ [3]	"اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نظامِ شوریٰ پسند کیا ہے جس کے بعد کسی شخص کو اپنی خواہشات کی پیروی کا موقع نہیں رہا، ہم نے امامت کے معاملہ پر مشورہ کے بعد حضرت علیؓ پر متفق ہو گئے ہیں۔ لہٰذا تم بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔"

ان تصریحات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُمّت کے اس اعلیٰ طبقہ کا اقتدار کتنا وسیع اور قوی ہے۔

شیخ محمد خضریؒ لکھتے ہیں:

"شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" کا خطاب پوری اُمّت سے ہے اسی وجہ سے مسلمانوں کے

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۵۶ ، [2] الامامۃ والسیاسۃ ص ۴۲ ، [3] ایضاً

تمام اہم کاموں کی اساس شوریٰ ہی ہے۔ ان میں اہم ترین کام خلیفہ کا انتخاب ہے جو بغیر مسلمانوں کے مشورہ اور ان کی رضامندی کے عمل میں نہیں آ سکتا۔

"شوریٰ" اہلِ حل وعقد کا دوسرا نام ہے جس میں کبارِ صحابہ رضوان اللہ علیہم شامل ہیں جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرفِ صحبت کے بیش از بیش مواقع فراہم ہوئے اور جنہیں نورِ بصیرت عطا کیا گیا تھا اور جو جانتے تھے کہ اُمت کی صلاح و فلاح کس کے انتخاب میں ہے۔" [1]

حضرت عمرؓ جب خلافت کو اپنے بعد چھ افراد کے حوالے کر چکے تو مشہور صحابی حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کو بلا کر کہا کہ "تم اپنی قوم کے پچاس آدمیوں کو لے کر ان چھ افراد کو تین دن کے اندر اندر اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرنے پر مجبور کر دو اور تین دن سے پہلے خلیفہ منتخب کیے بغیر انہیں چھوڑو نہیں۔" [2]

عراق کی مہم میں جس وقت حضرت ابو عبید ثقفیؓ شہید ہو گئے تو کمانڈری کا معاملہ بڑا ہی اہم تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا کچھ بزرگوں نے خود حضرت عمرؓ ہی کو کمانڈر بن جانے کا مشورہ دیا لیکن اکثریت اس رائے کے خلاف تھی، اس وقت حضرت عمرؓ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے ہیں وہ مسئلہ شوریٰ اور اہلِ حل وعقد کی حیثیت پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں:

يَحِقُّ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَاَمْرُهُمْ	مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ
شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَاِنِّيْ	ان کے معاملات شوریٰ کے ذریعہ
اِنَّمَا كُنْتُ كَرَجُلٍ	طے پائیں، میں تمھیں جیسا ایک فرد ہوں
مِنْكُمْ حَتّٰى صَرَفَنِيْ	جب تمھارے اصحابِ رائے نے
ذَوُو الرَّاْيِ مِنْكُمْ	مجھے میدانِ جنگ میں جانے سے
عَنِ الْخُرُوْجِ	روک دیا ہے تو میری بھی رائے قرار

---

[1] اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء، ص ۱۲

[2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۲

فَقَدْ رَأَيْتُ اَنْ اُقِيْمَ وَ اَنْ اَبْعَثَ رَجُلاً۔ [1]

پائی کہ مدینہ میں مقیم رہوں اور کسی دوسرے آدمی کو مہم پر بھیجوں۔

اسی وجہ سے علمائے اُمّت نے شورٰی کو دین کی ایک اہم بنیاد اور غیر متبدّل اصول کی حیثیت دی ہے اور جو امیر اس اصلِ اساسی کو منہدم کر دے تو اسے اپنے منصب سے ہٹا دیا جائے گا۔

ابنِ عطیہؒ کہتے ہیں:

وَالشُّوْرٰى مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِيْعَةِ وَعَزَائِمِ الْاَحْكَامِ مَنْ لَا يَسْتَشِيْرُ اَهْلَ الْعِلْمِ وَالدِّيْنِ فَعَزْلُهٗ وَاجِبٌ هٰذَا مَالَا خِلَافَ فِيْهِ۔ [2]

حکمِ شورٰی اساساتِ دین اور قطعی احکام میں سے ایک ہے جو حاکم اہلِ علم و دین سے مشورہ نہیں کرتا اس کا معزول کر دینا واجب ہے یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں پایا جاتا۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ جنین کی دیت کے سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کیا تھا، اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے آٹھویں صدی کے بلند پایہ محدّث علامہ ابنِ دقیق العیدؒ لکھتے ہیں:

وَاسْتِشَارَةُ عُمَرَ فِيْ ذٰلِكَ اَصْلٌ فِي الْاِسْتِشَارَةِ فِي الْاَحْكَامِ اِذَا لَمْ تَكُنْ مَعْلُوْمَةً لِلْاِمَامِ۔ [3]

حضرت عمرؓ کا اس معاملہ میں مشورہ کرنا ایک اصولی حیثیت رکھتا ہے جب کہ احکام، امام کو معلوم نہ ہوں۔

علامہ رشید رضا مرحوم نے اس پہلو کو خوب واضح الفاظ میں پیش کر دیا ہے:

وَالظَّاهِرُ اَنَّ طَاعَتَهُمْ تَجِبُ عَلَى الْحُكُوْمَةِ وَ

واضح بات تو یہ ہے کہ "اولالامر" کی اطاعت حکومت اور افرادِ امّت

اساسات
دین امر

---

[1] الفاروق ہیکل ج ۲ ص ۲۰۹

[2] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۹۵

[3] احکام الاحکام ج ۴ ص ۹۸۔

أَفْرَادِ الْأُمَّةِ إِذَا هُمْ
أَجْمَعُوا وَأَنَّهُ يَجِبُ
عَلَى الْحَاكِمِ وَالْمَحْكُوْمِ
رَدُّ الْمَسَائِلِ الْحَامَّةِ وَ
الْمُتَنَازَعِ فِيهَا إِلَيْهِمْ
سَوَاءٌ اجْتَمَعُوا بِأَنْفُسِهِمْ
أَوْ بِطَلَبِ الْأُمَّةِ أَوْ بِطَلَبِ
الْحُكُوْمَةِ بِشَرْطِ أَنْ
يَكُوْنُوْا هُمْ هُمْ۔ [1]

دونوں پر واجب ہے جب وہ کسی
بات پر متفق ہو جائیں اور امیرِ مملکت
اور افرادِ اُمّت پر واجب ہے کہ
وہ مختلف فیہ امور اور عام مسائل میں
ان کی طرف رجوع کریں۔ یہ اولوالامر
خواہ از خود جمع ہو گئے ہوں یا اُمّت
کے طلب کرنے یا حکومت کی طلب سے
مجتمع ہو گئے ہوں بشرطیکہ وہ صحیح
معنی میں اہلِ حل و عقد ہوں۔

روزمرّہ کے معاملات میں مشورہ ضروری نہیں ہے:

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا روزمرّہ کے معاملات میں بھی مشورہ ضروری ہے؟ اور یہ کہ مشورہ لینے کے بعد شوریٰ کی رائے کی پابندی بھی ضرور ہی کرنی چاہیئے؟ اس کا جواب ہم گزشتہ اوراق میں اشارۃً دے چکے ہیں، یہاں ہم کسی قدر تفصیل سے کلام کرنا چاہتے ہیں۔ صدرِ اوّل میں اربابِ حل و عقد ایسے ہی معاملات میں مجتمع ہوتے تھے جو اُمّت کے حق میں فیصلہ کن اور حد درجہ نزاکت کے حامل ہوتے تھے۔ یہ پورا طبقہ چونکہ اُمّت کا نمائندہ ہوتا تھا، اس لیے اس کی اطاعت بھی امیر پر واجب ہوتی ہے لیکن روزمرّہ کے مسائل میں یہ طبقہ شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ خلیفہ زیرِ بحث مسئلہ میں جسے اہل تر سمجھتا اس سے مشورہ کر لیتا اور اس مشورہ کی پابندی اس پر لازمی بھی نہیں ہوتی تھی۔ شریعت نے گو ایسے معاملات میں مشورہ کرنے کو حد درجہ مستحسن قرار دیا ہے اور ان کے مشورہ سے خواہ مخواہ انحراف کو ناپسند کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان معاملات میں امیر اور قاضی کو اپنے اجتہاد سے کام کرنے کا حق بھی عطا کیا ہے۔ اس قسم کے تعامل کے نمونے [illegible]ش کریں گے۔ یہاں صرف

---

[1] تفسیر المنار ج ۵ ص ۲۰۰۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور اکابرِ اُمت کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَمَّا أَرَادَ أَنْ يَّبْعَثَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ قَالَ كَيْفَ تَقْضِيْ إِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟ قَالَ أَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، قَالَ فَإِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَالَ فَإِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟ قَالَ أَجْتَهِدُ رَأْيِيْ وَلَا آلُوْ فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَدْرَهُ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لِمَا يَرْضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ [1]

جس وقت حضرت معاذؓ کو رسول اللہؐ نے یمن بھیجا تو دریافت کیا۔ جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو فیصلہ کس طرح کروگے؟ جواب دیا کتاب اللہ کے مطابق، پھر آنحضرتؐ نے دریافت کیا۔ اگر اللہ کی کتاب میں کوئی حل نہ ملے تو کیا کروگے؟ جواب دیا، سنتِ رسول کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔ اگر کتاب وسنت دونوں میں کوئی واضح راہنمائی نہ ملے تو کیا طریقہ اختیار کروگے؟ حضرت مُعاذ نے کہا۔ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور راہِ صواب پانے میں اپنی سی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔ حضورؐ نے مسرت سے انکے سینہ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ خدا کا شکر ہے اس نے اپنے رسولؐ کے قاصد کو رسولؐ خدا کی مرضی کے مطابق ہدایت عطا کی۔

---

[1] ابوداؤد کتاب القضاء، باب اجتہاد الرائی فی القضاء۔ ترمذی ابواب الاحکام باب ماجاء کیف یقضی القاضی؟ اس حدیث کی سند غیر متصل ہونے کی وجہ سے امام ترمذیؒ نے اس کی صحت پر شبہ کیا ہے۔ امام ابنِ قیمؒ نے ایک لطیف بحث کے ذریعہ اس کی صحت ثابت کی ہے۔ اعلام الموقعین ج ۱ صہ ۱۷۵، ۱۷۶۔

حضرت عمرؓ قاضی شریحؒ کو لکھتے ہیں :

" اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کے بارے میں کتاب و سنّت اور ائمہ صالحینؒ کے فیصلوں سے کوئی واضح ہدایت نہ ملتی ہو تو تم خود بھی اجتہاد کر سکتے ہو اور مجھ سے مشورہ بھی کر سکتے ہو، مجھ سے مشورہ کرنا تمھارے حق میں بہتر ہی ہوگا۔[1]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں :

" قاضی کے اندر پانچ اوصاف پائے جانے چاہئیں، ان میں سے ایک کا بھی فقدان ایک نقص ہے، وہ گزشتہ مقدمات کا عالم، اہل الرائے سے مشورہ کرنے والا، خصم کے مقابلہ میں حلیم، ملامت گروں کی ملامت کو انگیز کرنے والا ہو۔"[2]

مالیات کا ذمہ دار کن صفات کا حامل ہونا چاہیے۔ اس کی تشریح امام ابو یوسفؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے :

فَلْيَكُنْ فَقِيهًا عَالِمًا	چاہیئے کہ وہ فقیہہ ہو، عالم ہو،
مُشَاوِرًا لِأَهْلِ الرَّأْيِ	اہل الرائے سے مشورہ کرنے والا ہو اور
عَفِيفًا۔[3]	ناجائز امور سے پرہیز کرنے والا ہو۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

إِذَا نَزَلَ بِالْحَاكِمِ الْأَمْرُ	جب حاکم کے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش
يَحْتَمِلُ وُجُوهًا أَوْ	آجائے جو مختلف پہلو اپنے اندر رکھتا ہو
مُشْكِلٌ يَنْبَغِي لَهُ أَنْ	یا کوئی مشکل پیدا ہو تو اسے مشیروں سے
يُشَاوِرَ۔[4]	مشورہ کرنا چاہیئے۔

علامہ علاء الدین کاشانی حنفی المتوفی ۵۸۷ھ فرماتے ہیں :

---

[1] نسائی کتاب القضاء باب الحکم باتفاق اہل العلم بیہقی ج ۱۰ ص ۱۱۰ [2] رواہ البخاری موقوفاً کتاب الاحکام باب متی یستوجب القضاء، والبیہقی مرفوعاً ج ۱۰ ص ۱۱۷ [3] کتاب الخراج ص ۱۲۷

[4] کتاب الام ج ۷ ص ۸۶

اَنْ مَجْلِسَ مَعَهُ ..... جَمَاعَةٌ مِنْ اَهْلِ الْفِقْهِ اُشَاوِرُهُمْ وَ يَسْتَعِيْنُ بِرَأْيِهِمْ فِيْمَا يَجْهَلُهُ مِنَ الْاَحْكَامِ[لہ]

قاضی کے ساتھ (مجلس عدالت) میں اہلِ فقہ کی ایک جماعت بیٹھے جن سے وہ ان احکام میں جنہیں وہ نہیں جانتا ہے مشورہ کرے اور ان کی رایوں سے مدد لے۔

مشیروں کی ذمہ داریاں :

اسلام نے ایک طرف عام افراد سے لے کر کارپردازانِ حکومت تک کو مشورہ کرنے اور اسے قبول کرنے کا حکم دیا ہے دوسری طرف اس نے مشیروں کو اپنی نازک ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا ہے کہ ایک شخص تمہاری صداقت و امانت پر اعتماد کرتا ہے، مسائل کی نیرنگیوں میں تمہیں مشعلِ راہ سمجھتا ہے، اگر تم نے اسے راہِ صواب دکھانے کے بجائے ظلمتوں بھرے جنگل میں لا کر چھوڑ دیا تو تم نے انسانیت کا خون کر دیا، اپنے ایمان و اسلام اور تقویٰ و طہارت کو پامال کر دیا اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں سے سراسر خسران و نامرادی کی متاع خریدی کیوں کہ یہ صلاحیتیں تمہارے اندر خیر خواہی اور غم خواری کے لیے پیدا کی گئی تھیں۔

اس مقصد کے لیے اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر نصح اور خیر خواہی کی جلوہ گری دیکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ درندوں اور وحشیوں کا بھٹ بننے کے بجائے اخوت و راحت، دل سوزی و غم خواری کا منبع بن جائے جہاں سے خیر و خوبی کے چشمے پھوٹنے لگیں اور ہر فرد دوسرے فرد کو اپنا بھائی، اپنا شریکِ رنج و راحت اور اپنا راز داں و خیر خواہ سمجھنے لگے۔

لیکن یہ وہ خیر خواہی نہیں جس میں ایک انسان اندھی عصبیت کے تحت دوسرے کی حمایت پر کمر بستہ ہو جاتا ہے خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل، بلکہ یہ وہ خیر خواہی ہے جو اشخاص سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق اصول سے ہوتا ہے۔ ایک مومن جب کسی کو حق پر دیکھے گا تو

[لہ] بدائع الصنائع ج ۷، ص

اس کی ساری توانائیاں حق اور دعویدارِ حق کی حمایت میں مصروف ہو جائیں گی چاہے وہ اس کا عزیز ہو یا کوئی اجنبی، اس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ، وہ اس کے حدودِ جغرافیہ کے اندر رہتا ہو یا باہر۔

اس کے برعکس جب وہ اپنے بھائی کے اندر کوئی نقص یا عیب دیکھے گا یا اسے حق کے بجائے باطل کی راہ پر گامزن پائے گا تو اس کی صلاحیتوں کا ایک ذرہ بھی باطل کے تعاون میں صرف نہیں ہو گا، ہاں وہ اپنے بھائی کو باطل کی تباہیوں اور نامرادیوں سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن سعی کرے گا۔

تمیم داریؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا:

"دین خیر خواہی کا نام ہے، صحابہ نے دریافت کیا، خیر خواہی کس کے ساتھ کی جائے، آپؐ نے جواب دیا، "اللہ کے ساتھ، اللہ کی کتاب کے ساتھ، اللہ کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے راہنماؤں اور عام مسلمانوں کے ساتھ"[1]

ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا، اپنا بھائی خواہ ظالم ہو یا مظلوم اس کی مدد کرو۔ صحابہؓ نے دریافت کیا، مظلوم کی مدد تو ہو سکتی ہے، ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ آپؐ نے جواب دیا ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے ظلم سے باز رکھو۔[2]

اس سے آگے بڑھ کر اسلام ایک اور حقیقت ذہن نشین کراتا ہے وہ یہ کہ دوسروں کی بھلائی اور خیر خواہی سے خود تمھارا بھلا ہے۔ دوسروں کو صحیح راہ سمجھاتے ہو تو اس سے خود ہی اپنے لیے فلاحِ آخرت اور ثوابِ عقبیٰ کا ذخیرہ جمع کرتے ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے:

مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهٖ۔[3]	جو شخص کسی بھلائی کی طرف راہنمائی کرے تو اسے بھلائی کرنے والے جیسا ثواب ملے گا۔

---

[1] صحیح مسلم، ابوداؤد، کتاب الآداب باب فی النصیحۃ، [2] بخاری ابواب المظالم والقصاص باب اعن اخاک ظالماً او مظلوماً، [3] ابوداؤد، کتاب الآداب باب فی الدال علی الخیر۔

ان عمومات سے اندازہ لگایئے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر کس قسم کی رُوح پیدا کرنا چاہتا ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ اس کے نام لیوا اس قدر نیک سیرت اور پیکرِ حسنِ عمل ہوں کہ اپنے معاشرہ میں کسی گندے عمل اور ناپاک کردار کو پنپنے نہ دیں اور جیسے ہی یہ اپنا سر اٹھائے اس کا سر کچل کر رکھ دیا جائے۔

ایک مومن جس طرح کسی فرد کے اندر بدی کی حکمرانی نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح جبینِ حکومت اور اربابِ بست وکشاد کے چہروں پر بھی بدعملی کے داغ دھبے برداشت نہیں کر سکتا، اس کا فرض ہے کہ ہر گمراہ کو راہِ صواب دکھائے اور ہر طالبِ خیر کو خیر کی طرف راہنمائی کرے جس طرح روئی کے گالے اور آگ کے شعلے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، اسی طرح مومن اور بدخواہی کا بھی اتحاد ناممکن ہے یہ اصول اپنے عموم میں جس طرح افراد کو لیے ہوئے ہے، اسی طرح اپنی وسعت میں حکومت کے ایوانوں پر بھی حاوی ہے۔ ایک وہ شخص جو کسی فرد کی تباہی نہ دیکھ سکتا ہو کیا اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ قوموں کی تباہی کو ٹھنڈی آنکھوں سے دیکھے گا؟

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "تباہی اور خسران ہے اس دھوکا باز کے لیے"۔[1] صحابہ نے سوال کیا کہ آپؐ کس قسم کے فریب دہندہ کو مراد لے رہے ہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا، میرا روئے کلام اس مکار کی طرف ہے کہ جس کے سفلہ پن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب امیر سچ کہتا ہے تو بھی یہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور دروغ بافی سے کام لیتا ہے تو بھی اس کی جی حضوریاں اس کا ساتھ دیتی ہیں۔[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کعب بن عجرہؓ سے کہا:

"خدا تمھیں بے وقوفوں کے دورِ امارت کے شر سے محفوظ رکھے"۔ کعبؓ نے پوچھا "بے وقوفوں کی امارت سے آپؐ کی کیا منشا ہے؟" آپؐ نے جواب دیا "میرے بعد ایسے لوگوں کے ہاتھ میں بھی زمامِ اقتدار آئے گی جو میرے طریقے کی اتباع نہیں کریں

---

[1] حدیث میں لفظ "الذریبہ" ہے جو شکاری کی کمین گاہ کو کہتے ہیں [2] کنز العمال ج ۳ ص ۱۷۲۔

گے۔ اور میری بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر گامزن نہیں ہوں گے۔ جو شخص ان کی غلط روی کی تائید کرے گا اور ان کے ظلم میں ان کا ہاتھ بٹائے گا ایسے شخص کو مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ قیامت کے دن میرے حوض پر حاضر ہو سکے گا لیکن جو شخص ان کے جھوٹ کی تصدیق نہیں کرے گا اور ان کی جابرانہ روش میں ان کا دست و بازو نہیں بنے گا تو ایسے شخص کا تعلق مجھ سے ہے اور میرا اس سے، اور وہ قیامت کے دن میرے حوض پر آ سکے گا۔" [1]

بعض اوقات آپؐ نے ظالم کے ظلم کا ساتھ دینے پر اس سے بھی زیادہ پُرہول وعیدیں سنائی ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا:

مَنْ اَعَانَ ظَالِمًا عَلٰی ظُلْمِہٖ جَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ عَلٰی جَبْھَتِہٖ مَکْتُوْبٌ آیِسٌ مِنْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ۔ [2]	جس نے کسی ظالم کی اس کے ظلم میں مدد کی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی پیشانی پر —— مایوس رحمتِ الٰہی —— لکھا ہوا ہو گا۔

ایک اور حدیث ہے:

مَنْ مَشٰی مَعَ ظَالِمٍ لِیُعِیْنَہٗ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔ [3]	جو شخص ظالم کی دیدہ و دانستہ مدد کے لیے قدم اٹھائے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

ان وعیدوں کے جاننے کے بعد ایک مسلمان جس کے دل میں ذرّہ برابر خوفِ خدا اور محاسبۂ آخرت کا یقین ہو۔ کیا وہ اس مشینری کا کل پرزہ بن سکے گا جس میں شب و روز حق کو پیسا جاتا ہو جہاں صدق و صفا اور عدل و انصاف کے حلقوم پر چھری پھیری جاتی ہو جہاں جور و جفا اور معصیت کی وجہ سے زمین و آسمان کی وسعتیں تنگ ہو گئی ہوں؟ اور اگر کوئی

---

[1] مستدرک حاکم ج ۴ ص ۷۹ ورواہ الترمذی والنسائی مع اختلافِ یسیر۔ [2] کنز العمال ج ۳ ص ۲۰۵، [3] مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی باب الظلم۔

شخص اپنے دعوئ ایمان کے باوجود یہ روش اختیار کرتا ہے تو وہ کتمانِ حق کا مجرم ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ	اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے
شَهَادَةً عِنْدَهُ	جس نے اپنے پاس اللہ کی شہادت
مِنَ اللّٰهِ۔	رکھتے ہوئے بھی اسے چھپا دیا۔

اس آیت میں حق کے دیدہ و دانستہ چھپانے کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے اور یہ آیت اپنے عموم میں ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن میں کتمانِ حق ہوتا ہو، حق کے زوال اور بربادی کی پُرسکوت داد دی جائے یا صحیح رہنمائی کے مؤقف میں ہونے کے باوجود کلمۂ حق کہنے سے پس و پیش کیا جائے یا اور کوئی صورت ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ	بہترین جہاد جابر حاکم کے رُوبرُو
عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔	کلمۂ حق کا اظہار ہے۔

آپؐ کا ایک اور فرمان ہے:

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ	جس شخص سے کسی ایسے علم کی بابت
ثُمَّ كَتَمَهُ اُلْجِمَ يَوْمَ	دریافت کیا جائے جسے وہ جانتا ہے
الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ	پھر وہ اسے چھپا دے تو قیامت کے دن
النَّارِ۔ [1]	اس کے منہ میں آگ کی لگام پہنائی جائیگی۔

ان تصریحات سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا ایک مسلم مشیر و وزیر مسلمان رہتے ہوئے پرستارِ جاہ و منصب، زمانہ ساز اور ہوا کا ساتھی ہو بھی سکتا ہے؟ کیا چاپلوسی اور کاسہ لیسی اس کی پاکیزہ فطرت سے میل کھا سکتی ہے؟ کیا اس کے نزدیک اقتدار کی مرضی و نامرضی اور حاکم کی چشم و ابرو کے اشارے معیارِ حق بن سکتے ہیں یا خدا کی نازل کردہ ہدایت؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشیروں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم بحوالۂ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ۔

"اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" "جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے۔" اس کا فرض ہے کہ امانت کو بلا کم و کاست جوں کی توں طالب مشورہ کے حوالہ کر دے، نعوذ باللہ اگر کسی مشیر کے اندر یہ تصور جاگزیں ہو جائے تو وہ کسی کو گمراہ کن اور غلط مشورہ دے سکتا ہے؟ کیا اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جانتے بوجھتے حق پر پردہ ڈال دے گا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ اَشَارَ عَلٰى اَخِيْهِ بِاَمْرٍ يَعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِیْ غَيْرِهٖ فَقَدْ خَانَهٗ ۔ [1]	جو شخص اپنے بھائی کو کسی بات کا مشورہ دے اور وہ جانتا ہو کہ بھلائی دوسرے مشورہ میں ہے تو اس نے اپنے بھائی کے ساتھ خیانت کی۔

اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک اور صالح مشیروں کے انتخاب کی طرف ایک اچھوتے انداز میں آمادہ کیا ہے:

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِالْاَمِيْرِ خَيْرًا جَعَلَ لَهٗ وَزِيْرَ صِدْقٍ اِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهٗ وَاِنْ ذَكَرَ اَعَانَهٗ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ غَيْرَ ذٰلِكَ جَعَلَ لَهٗ وَزِيْرَ سُوْءٍ اِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ وَاِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ ۔ [2]	جب اللہ کسی امیر کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ایک سچا وزیر عطا کرتا ہے جو اس کی غفلت پر یاد دہانی کراتا ہے اور اگر وہ یاد کر لیتا ہے تو اس کی مدد کرتا ہے اور جب اللہ کسی امیر کے ساتھ بھلائی نہیں چاہتا تو اس کیلئے ایک برا وزیر مقدر کر دیتا ہے جو اسکے بھولنے پر یاد نہیں دلاتا اور اگر وہ یاد بھی کر لیتا ہے تو اسکی مدد نہیں کرتا۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے: وَاسْتَشِرْ فِیْ دِيْنِكَ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ اللّٰهَ[3] "تم اپنے

---

[1] ابوداؤد کتاب العلم باب التوقی فی الفتیا [2] ابوداؤد باب اتخاذ الوزیر [3] کتاب الخراج ص۱۷

دین کے معاملات میں خدا کی خشیت رکھنے والوں سے مشورہ کرو۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

وَلَا يَنْبَغِيْ لَهُ (اَيِ الْحَاكِمِ) اَنْ يُشَاوِرَ جَاهِلًا لِاَنَّهُ لَا مَعْنٰى لِمُشَاوَرَتِهٖ وَلَا عَالِمًا غَيْرَ اَمِيْنٍ فَاِنَّهُ رُبَّمَا اَضَلَّ مَنْ يُشَاوِرُهُ وَلٰكِنَّهُ يُشَاوِرُ مَنْ جَمَعَ الْعِلْمَ وَالْاَمَانَةَ۔ [1]

حاکم کو کسی جاہل سے مشورہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ جاہل سے مشورہ کرنا ایک بے معنی سی بات ہے اور نہ ایسے عالم سے مشورہ کرنا چاہیئے جو اپنے مشورہ میں امین نہ ہو کیونکہ وہ مشورہ لینے والے کو گمراہ کر سکتا ہے لہٰذا حاکم کو ایسے شخص سے مشورہ کرنا چاہیئے جو علم و امانت دونوں کا جامع ہو۔

یہ ہے مشیروں کی ذمہ داریوں کا ایک اجمالی نقشہ جسے شریعت نے پیش کیا ہے۔

---

[1] کتاب الام جلد ۷ صہ ۸۶۔

باب دوم

[illegible]

باب دوم

دوم

شورائی نظام تاریخ کی روشنی میں

کی روشی

نی ر

متن

شورائی نظام تاریخ کی روشنی میں :

امیر اور ارباب حل وعقد کی حیثیت اور مشیروں کی ذمہ داریوں سے یک گونہ واقفیت کے بعد آیئے اس امر کا بھی جائزہ لے دیکھیں کہ ان پاکیزہ اصولوں پر شارح قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے سچے جانشینوں کے دور میں کس قدر اور کس طرح عمل ہوا ہے ؟ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر آئین ودستور کی صحیح قدر وقیمت پرکھی جا سکتی ہے ۔ وہ تمام ضابطے اور قوانین جو رفعتِ ماہ وانجم رکھنے کے باوجود انسانیت کے آلام اور مصیبتیں کے چارہ گر نہ ہوں سراسر بے سود ہیں ، کتنے ایسے خاکے آج بھی زیب قرطاس بنے ہوئے ہیں جن کی عظمت وسربلندی پر آج بھی ہزار ہا انسان سر دھنتے ہیں لیکن ایک دن بھی انہیں اس کارزارِ عالم میں قالبِ عمل نصیب نہیں ہوا ، شاید یہ خواب اسی لیے دکھائے گئے کہ وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں ۔ یہ اسلام ہی کا وصفِ امتیازی ہے کہ اس نے جتنے بھی اصول پیش کیے اس کے ماننے والوں نے اسی صفحۂ زمین پر ان کی زندہ وتابندہ تصویر کشی کر کے رکھ دی اور انہیں فکر وخیال کی تنگنائیوں سے نکال کر حیاتِ انسانی کے وسیع گوشوں میں پھیلا دیا ۔

جاہلیت کا شورائی نظام :

اسلام کے شورائی نظام کی عملی تفسیر سے واقفیت کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھا جائے جس میں یہ نظام قائم ونافذ ہوا تھا ۔ اس سے اس راہ کی بے شمار دشواریاں از خود حل ہو جائیں گی ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت سرزمینِ مکہ پر صدائے توحید بلند کی تھی تو اس وقت تہذیب ناآشنا قریش میں بعض ایسی جوہری خصوصیات رُونما ہونے لگی تھیں جن سے ایک مضبوط ریاست کی تشکیل میں بہت کچھ مدد لی جاسکتی تھی، یہ موادِ خام اس قابل تھا کہ ذرا سی اصلاح کے بعد اس سے پائیدار اور محکم اوزار تیار کیے جاسکتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ قریش کے اندر اجتماعی نظم اور مرکزیت کے نمایاں اثرات پیدا ہو چلے تھے جس کی واضح مثال قصی کی ریاست کا وجود ہے۔ اس شخص کا اقتدار تمام قبائلِ قریش پر حاوی تھا اور قریش کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے سارے عرب میں اس کی عظمت کا سکہ رواں تھا، یہی نہیں بلکہ اس کے دور میں ہمیں ابتدائی طرز کا پارلیمنٹری سسٹم بھی نظر آتا ہے اور قریش کے نمائندے اپنے اہم معاملات کو اس کی سرپرستی میں شوریٰ کے ذریعے طے کرتے تھے۔

ہمارے ایک قدیم مورخ ابنِ ہشام المتوفی ۲۱۳ھ قصی کے حالات کے تحت لکھتے ہیں:

فَكَانَ قُصَيٌّ اَوَّلَ بَنِيْ	کعب بن لوی کی اولاد میں قصی پہلا
كَعْبِ بْنِ لُؤَيٍّ اَصَابَ	شخص تھا جسے مکہ میں سلطنت حاصل
مُلْكًا اَطَاعَ لَهٗ بِهٖ	ہوئی اور جس کی قریش اطاعت کرنے
فَكَانَتْ اِلَيْهِ الْحِجَابَةُ	لگے۔ اس کے ہاتھ میں بیت اللہ کی
وَالسِّقَايَةُ وَالرِّفَادَةُ وَالنَّدْوَةُ	نگرانی، حاجیوں کو پانی پلانا، حج کے
وَاللِّوَاءُ فَحَازَ شَرَفَ مَكَّةَ	زمانہ میں باہر سے آنے والوں کی مہمانی،
كُلَّهٗ ..... فَمَا تُنْكَحُ امْرَأَةٌ	اکابرِ قریش کی مجلس کی صدارت، جنگی
وَلَا يَتَزَوَّجُ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ	قیادت جیسے پانچ کلیدی منصب تھے
وَلَا يَتَشَاوَرُوْنَ فِيْ اَمْرٍ	اس طرح اس نے اپنے دامن میں
نَزَلَ بِهِمْ وَلَا يَعْقِدُوْنَ	مکہ کے سارے شرف و مجد کو سمیٹ
لِوَاءً لِلْحَرْبِ قَوْمٍ فِيْ	لیا تھا ..... قریش کے کسی مرد یا

غَيْرِهِمْ اِلَّا فِيْ دَارِهٖ يَعْقِدُهٗ لَهُمْ بَعْضُ وُلْدِهٖ وَمَا تُدَرَّعُ جَارِيَةٌ اِذَا بَلَغَتْ اَنْ تُدَرَّعَ مِنْ قُرَيْشٍ اِلَّا فِيْ دَارِهٖ يُشَقُّ عَلَيْهَا فِيْهَا دِرْعُهَا ثُمَّ يَنْطَلِقُ بِهَا اِلٰى اَهْلِهَا۔ [1]

عورت کا نکاح، پیش آمدہ کسی اہم معاملہ میں مشورہ اور کسی اجنبی قبیلہ سے جنگ کا فیصلہ اسی کے گھر پر ہوتا تھا جس کا صدر اسی کی اولاد میں سے کوئی ایک ہوتا تھا۔ جب کوئی لڑکی بالغ ہوتی تو اسی کے گھر میں اسے اوڑھنی اُڑھائی جاتی اور اسے اس کے گھر پہنچایا جاتا (گویا یہ اس کے قابلِ نکاح ہونے کا اعلان تھا)

آنحضرتؐ کی ہجرت کے سلسلے میں ہی ابنِ ہشام لکھتے ہیں:

فَحَذِرُوْا خُرُوْجَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَعَرَفُوْا اَنَّهٗ قَدْ اَجْمَعَ لِحَرْبِهِمْ فَاجْتَمَعُوْا لَهٗ فِيْ دَارِ النَّدْوَةِ وَهِيَ دَارُ قُصَيِّ بْنِ كِلَابٍ الَّتِيْ كَانَتْ قُرَيْشٌ لَا تَقْضِيْ اَمْرًا اِلَّا فِيْهَا يَتَشَاوَرُوْنَ فِيْهَا۔ [2]

آنحضرتؐ کے ہجرت کر جانے سے قریش خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا کہ آپؐ ان سے جنگ کی تیاری کر رہے ہیں پس وہ دار الندوہ یعنی قصی بن کلاب کے گھر پر مشورہ کے لیے جمع ہوئے اور قریش کسی اہم معاملہ کا فیصلہ اس مقام پر جمع ہو کر مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔

ان تصریحات نے یہ ثابت کر دیا کہ قریش ایک ایسے سادہ نظامِ حکومت سے آشنا تھے جس کے خمیر میں شورائیت گوندھی گئی تھی، مکہ کے نظام کا یہ پہلو اسلامی روح کے عین مطابق تھا اس لیے اسلام نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اسے باشندگانِ مکہ کو ایک ایسے

---

[1] سیرت ابنِ ہشام مطبوعہ لیڈن ص ۸۰ [2] بخاری کتاب المناقب، مسلم کتاب الامارۃ۔

نظامِ مملکت کا تصور دینے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی جس کی اساس شورائیت پر رکھی گئی ہو۔ یہیں سے یہ گتھی بھی حل ہو جاتی ہے کہ قرآن اور بالخصوص حدیث میں شورای کی تفصیلات کیوں نہیں دی گئیں کیونکہ قریش کا شورائیت سے مانوس ذہن صرف یہ جان کر کہ اسلامی ریاست کا نظم شورائی ہوگا ازخود تفصیلی خدوخال ترتیب دے لے سکتا تھا اور جہاں کہیں فکر وعمل میں کوئی خامی محسوس کی گئی اس کی اصلاح کر دی گئی اور جزئی اور وقتی ہدایات کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔

قریش کا مقام:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قریش کو سارے عرب پر مذہبی پیشوائی اور بعض سیاسی پہلوؤں میں قیادت کا منصب حاصل تھا، باشندگانِ عرب کی نگاہیں ہر معاملہ میں اسی رہنما قبیلہ کی طرف اٹھتی تھیں اور قریش جس جانب اپنا رخ کرتے تھے سارا عرب اسی کو اپنا قبلۂ مقصود قرار دے لیتا تھا۔

ابنِ ہشام نے واقعاتِ فتح مکہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ردّ و قبول میں اہلِ عرب کی نگاہیں اہلِ قریش پر جمی ہوئی تھیں اس لیے کہ قریش عرب کے قائد و رہنما، بیت اللہ اور حرم کے متولّی، حضرت اسمٰعیلؑ بن ابراہیمؑ کے نسب سے تعلق رکھنے والے اور عرب کے سردار تھے، قریش کی ان عظمتوں کا اہلِ عرب کو اقرار تھا، چونکہ قریش نے آنحضرتؐ کے مقابلہ میں عداوت اور جنگ کا جھنڈا گاڑ رکھا تھا اس لیے اہلِ عرب بھی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے لیکن جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش اسلام کے حلقۂ اطاعت میں آ گئے تو عربوں پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ اب ان کے اندر آنحضرتؐ کے مقابلہ اور عداوت کی تاب نہیں ہے پس وہ باآسانی حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے چلے گئے“۔ [1]

اسلام میں قریش کی حیثیت:

اس تاریخی بیان کو سامنے رکھنے سے قریش کی عظمت اور ان کی سیاسی پوزیشن کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس مقتدر اور باعظمت قبیلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] ابنِ ہشام

بعثت ہوئی، حق کی صدا سب سے پہلے اسی طبقہ کے کانوں سے ٹکرائی، گو یہ صدا ان کے لیے نامانوس تھی اور انہوں نے سچائی کی پکار کو ایک مجنون کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ آگے چل کر اس کے استیصال کے درپے ہو گئے اور اس لافانی صدا کو بے نتیجہ کر دینے کی ہر ممکن سعی کی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ شمعِ حق کے پروانے اور اس کے جاں نثار و شیدائی بھی قریش ہی کے دل و دماغ تھے، قریش ہی کا خونِ جگر تھا جس نے دعوتِ حق کے ننھے سے پودے کو پُر بہار اور بابرگ و بار بنایا۔

جب دعوتِ حق ارتقائی مراحل طے کرنے لگی تو قریش کے ان فداکاروں کو دو طرح کی برتری اور تفوق نصیب ہوئی، ایک دعوتِ اسلامی کے اولین دست و بازو اور اس کے نظریہ و مسالک کے رازداں ہونے کی حیثیت سے اور دوسری برتری خاندانِ قریش سے ہونے کی وجہ سے جو قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر قریش کو اس نئی دعوت میں بن راہنمائی اور لیڈری کا مقام حاصل ہو گیا گویا ہاتھ نہیں بدلے، فکر بدل گئی، قالب نہیں تبدیل ہوا، روح تبدیل ہو گئی۔

اسی حقیقت کو آنحضرتؐ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَيْشٍ
فِي هٰذَا الشَّأْنِ
مُسْلِمُهُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِهِمْ وَ
كَافِرُهُمْ تَبَعٌ لِكَافِرِهِمْ
وَالنَّاسُ مَعَادِنُ
خِيَارُهُمْ فِي
الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ
فِي الْإِسْلَامِ
إِذَا فَقِهُوا۔[1]

حکومت کے معاملہ میں لوگ قریش کے تابع ہیں ان میں کے مسلمان مسلمانانِ قریش کی اتباع کریں گے اور کافر کفارِ قریش کے پیچھے چلیں گے۔ لوگوں کی حیثیت کان کی سی ہے جو جاہلیت میں بہتر مقام پر رہے ہیں وہ اسلام میں بھی بہتر مقام پر رہیں گے بشرطیکہ وہ اس شرف کے ساتھ دین کا تفقہ بھی حاصل کر لیں۔

---

[1] بخاری کتاب المناقب، مسلم کتاب الامارۃ۔

اس حدیث کے آخری جملہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قریش کی یہ رفعت وعظمت اس کی ذاتی صلاحیتوں اور قائدانہ استعداد کی بنا پر ہے، سونا سونا ہی رہے گا خواہ اس پر گرد وغبار کی کتنی ہی تہیں چڑھی ہوئی کیوں نہ ہوں جیسے ہی یہ عارضی پردے اوپر سے ہٹا دیے جائیں گے اس کی تابانی پھر نکھر کر سامنے آجائے گی۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

"قریش اپنی فہم ودانائی کے لحاظ سے دوسرے دو آدمیوں کے ہم پایہ ہیں[1]"

غالباً یہی حکمت تھی کہ جنگ کے مواقع پر تک مہاجرین جہاں خیمہ زن تھے وہیں آپؐ بھی اقامت فرماتے[2] تاکہ آپؐ کے ہر سو فہیم اور سمجھ دار لوگ رہیں اور تعلیماتِ دین کو جذب کر سکیں۔

کہنے کا منشا یہ ہے کہ قریش محض اپنی مذہبی، پروہتی کے باعث ہی سارے عرب پر قیادت نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں ان کے ذاتی شرف وکمال کا بھی دخل رہا ہے، اسی قبیلہ کے مکھن نے جب اسلام کو اپنے سینہ میں جگہ دی تو پرچمِ قیادت بھی ان ہی کے حوالے کیا گیا۔

اسلام میں انصار کا مقام:

اسلام کے آغاز میں جب اس کے چند ناتواں ہمنواؤں کو ریگ زارِ عرب پوری طرح جھلس دینے پر آمادہ تھا اور صحرائے عرب کی پہنائیاں ان پر تنگ ہونے لگی تھیں تو ایک نئے طبقہ نے اپنی بے مثال قربانیوں اور جانفروشیوں سے دعوتِ حق کو استحکام بخشا اور اس کے مصیبت زدہ نام لیواؤں کو اپنے اندر جگہ دی، یہ طبقہ اپنی ان بیش بہا خدمات سے دعوتِ اسلامی کا دوسرا اہم عنصر قرار پایا اور آئندہ کے ہر موڑ میں اس کو نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

انصار کی یہ پوزیشن آنحضرتؐ نے اسی وقت واضح کر دی تھی جب کہ اہلِ مدینہ کے ایک نمائندہ نے بیعت عقبہ کے موقع پر دریافت کیا تھا کہ یا رسول اللہ اگر ہم اپنی کل متاعِ زیست حق کی سربلندی میں لگا دیں اور فی الواقع حق کا پرچم ہر سو لہرانے لگے تو کیا آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنے اصل وطن لوٹ جائیں گے؟ آپؐ نے جواب دیا "ہرگز نہیں"۔

---

[1] مستدرک حاکم ج ۴ ص ۷۲، السنن الکبریٰ ج ۳ ص ۱۲۱، [2] مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۲

اَلدَّمُ الدَّمُ وَالْهَدمُ الْهَدمُ
أَنْتُمْ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْكُمْ
أُحَارِبُ مَنْ
حَارَبْتُمْ وَأُسَالِمُ مَنْ
سَالَمْتُمْ ۔ [1]

تمہارا خون میرا خون ہوگا تمہاری حرمت میری حرمت ہوگی، تم جس سے جنگ کروگے میں اس سے جنگ کروں گا، تم جس سے صلح کروگے میں بھی اس سے صلح کروں گا۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَءً
مِنَ الْأَنْصَارِ وَلَوْ سَلَكَ
النَّاسُ وَادِيًا وَشِعْبًا
لَسَلَكْتُ وَادِيَ الْأَنْصَارِ
وَشِعْبَهَا ۔ [2]

اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی میں کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سب لوگ کسی ایک وادی میں چلیں اور انصار کسی اور وادی میں تو انصار جس وادی میں چل رہے ہیں میں اسی میں چلتا۔

یہ ایک سیاسی حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ بحیثیت امیر اس اہم عنصر کو نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ انصار کی مرضی و منشا تمام اہم اقدامات میں فیصلہ کن قوت کی حامل ہوگی، اسی وادی کی طرف قدم بڑھائے جائیں گے جس وادی کی طرف انصار گامزن ہوں گے، جس پاسنگ میں انصار کی آرا ہوں گی یقیناً وہ بھاری ثابت ہوگا۔

مہاجرین و انصار کی حیثیت:

اس طرح پہلے نمبر پر مہاجرین بالفاظِ دیگر قریش اور دوسرے نمبر پر انصار یہ دونوں طبقے اس نئی تحریک میں اُبھر کر سامنے آنے لگے۔ سقیفۂ بنی ساعدہ (جہاں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی تھی) کے موقع پر ایک انصاری مہاجرین سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ كَانَ

جب رسول اللہؐ تم میں سے کسی

---

[1] سیرت ابن ہشام ص۲۹۷، تاریخ کامل ج ۲ ص۲۰ [2] صحیح بخاری کتاب المغازی۔

إِذَا اسْتَعْمَلَ رَجُلاً	کو عامل مقرر کرتے تو ہمارے
مِنْكُمْ قَرَنَ مَعَهُ	ایک آدمی کو بھی اس کے ساتھ
رَجُلاً مِنَّا۔ [1]	بھیجتے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوات میں مسلمانوں کے دو علم ہوتے تھے۔ انصار کا علم سعد بن عبادہؓ تھامے ہوئے ہوتے اور پرچم مہاجرین حضرت علیؓ کے ہاتھ میں لہراتا۔ [2]

جنگِ بدر میں رئیسِ انصار سعد بن عبادہؓ شریک نہیں ہوئے تھے یا کسی اور وجہ سے ان کے بجائے عَلَمِ انصار سعد بن معاذؓ یا حباب بن منذرؓ انصاری کے ہاتھ میں تھا اور مہاجرین کا جھنڈا بدستور حضرت علیؓ لیے ہوئے تھے۔ [3]

ان دونوں طبقوں کی سابقیت و اوّلیت نے تحریکِ اسلامی میں ایک ایسا بلند مقام حاصل کر لیا کہ تحریک کے وسیع سے وسیع تر ہونے کے باوجود ہر فرد ہر معاملہ میں ان ہی دونوں طبقات کی طرف نظر اٹھاتا تھا جس طرح سارا عرب اسلام کے بارے میں قریش پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ اسی طرح تحریکِ اسلامی میں شامل ہونے والے بے شمار قبائلِ عرب اب ان دونوں طبقوں کی پالیسی کو اپنے لیے دستور العمل سمجھتے تھے وہ جس طرف دستِ صلح بڑھاتے ساری امت اس طرف امن و آشتی کے پیام بھیجتی وہ جس سے اعلانِ جنگ کرتے ساری اُمت اس سے برسرِ پیکار ہو جاتی۔

نہ صرف سیاسی اور تحریکی حیثیت سے مہاجرین و انصار کو یہ تاجِ عظمت نصیب ہوا تھا بلکہ فہمِ دین اور اس کے راز داں ہونے کی وجہ سے بھی ملّت کی قیادت کا انہیں حق حاصل تھا کیونکہ سب سے زیادہ ان ہی دو طبقوں کو شارحِ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت، علمِ دین اور تربیتِ کاملہ نصیب ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۷۶ ۔۔۔ [2] الاصابۃ فی تمییز الصحابہ ج ۲ ص ۳۱ تذکرہ نمبر ۳۱۷۳

[3] سیرت ابن ہشام ص ۴۳۳ ، البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۳۶۰۔

لِیَلِیَنِیْ اُولُو الْاَحْلَامِ وَالنُّھٰی ۔ ۱؎	نماز میں مجھ سے قریب اہلِ علم و عقل رہیں ۔

یہ "اولو الاحلام" کون تھے ؟ یہ مہاجرین و انصار ہی کے گروہ تھے جیسے کہ ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے ۔

كَانَ يُحِبُّ اَنْ يَلِيَهُ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ فِي الصَّلٰوةِ لِيَاخُذُوْا عَنْهُ ۔ ۲؎	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ آپ سے قریب نماز میں مہاجرین و انصار رہیں تاکہ وہ آپ سے (نماز کے طریقے) سیکھ سکیں ۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق اور قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہی دو گروہ اُمتِ مسلمہ میں عوامی پارٹیوں کی حیثیت رکھتے تھے اور لامحالہ ان ہی کو بست وکشاد کا حق حاصل تھا ان کا فیصلہ ساری امت کا فیصلہ ہوتا ، وہ جس نقطہ پر متحد ہو جاتے امتِ مسلمہ اسے دل وجان سے قبول کر لیتی ۔

لیکن ان دونوں نے دورِ حاضر کی سیاست اور ایک دوسرے کی حریف پارٹیوں کی حیثیت سے میدانِ عمل میں قدم نہیں رکھا تھا بلکہ اس اتحادِ مقدس کی اساس دین پر رکھی گئی تھی ، وہ دین جو ایک کو دوسرے کا غم گسار ، شریکِ رنج وراحت اور مونس وغم خوار بناتا ہے جس کا ہر صفحہ درسِ اخوت ومحبت دیتا ہے ، جس کا ہر کردار پیکرِ اخلاص وصداقت ہوتا ہے ، چشمِ فلک نے ان کی اخوت وہمدردی کا وہ نظارہ بھی دیکھا ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو اپنے مال ودولت میں برابر کا شریک وسہیم سمجھا تھا ۔ ۳؎

مقصد کے اس اتحاد اور یگانگت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مہاجر کے ہاتھ کو ایک ایک انصاری کے ہاتھ میں دے کر رشتۂ اخوت کو مزید

۱؎ صحیح مسلم ، کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف ۲؎ السنن الکبریٰ ج ۳ ص ۹۷ ، ۳؎ اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی بین المہاجرین والانصار ۔

ناقابلِ شکست کر دیا[1] تاکہ آپس میں اجنبیت اور نامانوسیت کا بالکلیہ خاتمہ ہو جائے اور ہر گروہ دوسرے کو اپنی ہی برادری سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ تک ان "غیروں" میں میراث کا سلسلہ قائم رہا۔[2]

اس تشریح سے دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک تو یہ کہ انصار و مہاجرین ہی وہ عوامی جماعتیں تھیں جنہیں سیادتِ امت کا منصب حاصل تھا اور جو دینی خدمات اور فہم و بصیرت کی وجہ سے قدرتی طور پر مستحقِ حل و عقد قرار پائیں۔

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ یہ دونوں جماعتیں فکر و مسلک کے اتحاد اور آنحضرتؐ کی قائم کردہ اخوت کے باعث ایک بن گئی تھیں اس لیے نظمِ مملکت میں کونسی جماعت کا کتنا حصہ ہوگا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو پایا۔ اگر کہیں اس قسم کی کوئی ناگوار صورت رونما ہوئی تو برادری نے فوراً ہی اس پر پردے ڈال دیے۔

مہاجرین و انصار کی سیاسی پوزیشن:

اگر آپ آنحضرتؐ کے ارشادات اور ابنِ ہشام کی تاریخی تصریحات سامنے رکھیں گے تو یہ حقیقت از خود متعین ہو جائے گی کہ ان آپس کے بھائیوں میں کس کو براہِ راست سیادتِ امت کا حق حاصل ہے اور کس کی حیثیت شریکِ کار اور مشیروں کی ہے؟

آنحضرتؐ نے اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا:

> "لوگو، میں انصار کے بارے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں ان کے حقوق پہچانو، وہ میرے رازدار ہیں انہوں نے اپنا حق تو ادا کر دیا لیکن ان کا حق ادا نہیں کیا گیا، لہٰذا ان کے محسن کے حسنِ عمل کو قبول کر لو اور ان میں سے کسی سے غلطی ہو جائے تو درگزر کر دو۔[3]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اخاء و الحلف، تفصیل سیرت ابنِ ہشام میں ہجرت کے واقعات کے تحت دیکھی جائے۔

[2] بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر قولہ و لکل جعلنا موالی الخ، ابو داؤد، کتاب الفرائض باب نسخ میراث العقد بمیراث الرحم

[3] بخاری کتاب المناقب باب قول النبی اقبلوا من محسنھم۔

اس تقریر میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انصار کو نظم ونسقِ مملکت کا اختیار نہیں حاصل ہوگا لہٰذا جو طبقہ برسرِ اقتدار آئے وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور صالح روش اختیار کرے کیونکہ یہ جماعت اپنی سابقہ خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کے لحاظ سے ایسی ہے کہ اس کا وزن محسوس کیا جائے اور اسے وہ مؤقف حاصل ہو جس کی وہ فی الواقع مستحق ہے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطاب مہاجرین سے کیا تھا[1] جس کے بعد انصار ومہاجرین کے مؤقف کے تعین میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ نے بارہا اس بات کی تصریح کی ہے کہ قریش ہی مملکت کے سربراہ کار ہوں گے[2] کیونکہ عرب سوائے قریش کے جھنڈے کے کسی اور کے عَلمِ اقتدار کے سایہ میں مجتمع نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار سے مخاطب ہو کر مہاجرین وانصار کی پوزیشن ان الفاظ میں واضح کی تھی۔

فَلَيْسَ اَحَدٌ بَعْدَ الْمُهَاجِرِيْنَ	مہاجرینِ اوّلین کے بعد ہمارے نزدیک
الْاَوَّلِيْنَ عِنْدَنَا	تم سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی اور نہیں
بِمَنْزِلَتِكُمْ فَنَحْنُ	ہے، ہم امراء ہوں گے اور تم
الْاُمَرَاءُ وَاَنْتُمُ الْوُزَرَاءُ	وزراء، کسی معاملہ میں مشورہ کرتے
لَاتُفْتَاتُوْنَ بِمَشُوْرَةٍ	ہوئے تمھیں الگ نہیں رکھا جائے
وَلَاتُقْضٰى دُوْنَكُمُ	گا اور تمھارے بغیر کوئی معاملہ طے
الْاُمُوْرُ۔[3]	نہیں پائے گا۔

قریش کی اس سیاسی پوزیشن کا فلسفیانہ تجزیہ ہمارے فلسفی مؤرخ ابنِ خلدون کی زبانی سنیے:

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۹۴، البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۳۹، [2] بخاری کتاب الاحکام، مسلم کتاب الامارۃ [3] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۳، الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۷

"درحقیقت قریش، مضر کا جوہر اور اس کا نچوڑ تھے، ان کو سارے عرب پر کثرتِ تعداد اور عصبیت کے لحاظ سے غلبہ و تفوق حاصل تھا، عرب ان کی اس برتری کو تسلیم کرتے تھے اور وہ بطوع و رغبت ان کے زیرِ نگیں رہ سکتے تھے، اگر ان کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں کلیدِ اقتدار ہوتی تو شیرازۂ امت کے پارہ پارہ ہو جانے کا اندیشہ تھا اور مضر کے دیگر قبائل میں اتنی استعداد اور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ امت کو انتشار کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچاتے ...... چونکہ نبی ہمیشہ اُمت کے اتحاد و اتفاق کا متمنی ہوتا ہے لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے لیے قریشیت کی شرط لگا دی تاکہ اُمت تحزب اور تفریق کا شکار نہ بن جائے۔ قریش کے اندر اتنی طاقت تھی کہ وہ زورِ اقتدار سے لوگوں پر حکم نافذ کر سکتے تھے، اس لیے ان کی قیادت میں کسی اختلاف کا اندیشہ نہیں تھا۔ قریش کا اتحاد تمام قبائلِ مضر کے اتحاد کا ہم معنی تھا اور مضر کا اتحاد سارے عرب کے اتحاد کا ذریعہ بن سکتا تھا۔"[1]

مرکزِ ریاست مدینہ کی حیثیت :

انصار و مہاجرین کے مُوقف کے یقین کے بعد آئیے ہم تاریخ سے سوال کریں کہ کیا دَورِ رسالت و خلفائے راشدین میں تمام اہم امور ان دونوں پارٹیوں کے مشورہ ہی سے طے پاتے تھے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں جماعتوں کا قیام دار السلطنت مدینہ ہی میں تھا یا کم از کم ان کے چیدہ اور نامور اشخاص کی کثرت جن پر ہر معاملہ میں نظریں اٹھ سکتی تھیں مدینہ ہی میں اقامت گزیں تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ اہلِ مدینہ کی رائے کو آخری حیثیت دے دی گئی اور مزید کسی رائے کے دریافت کرنے کی حاجت نہیں رہی۔

چونکہ ہماری آئندہ بحث اس امر پر منحصر ہے کہ اہلِ مدینہ کے اتحاد یا کثرتِ آراء ہی کو قانونی شکل حاصل تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ مدینہ کی حیثیت متعین کر لی جائے۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۹ - ۱۷۰

تاریخ کا ہر باخبر شخص واقف ہے کہ مدینہ کی ریاست خونی تلواروں اور نیزوں کے سائے میں وجود پذیر ہوئی۔ مدینہ ہر سو سے دشمنوں کے تیروں کا ہدف بنا ہوا تھا، کوئی شخص اس کے عروج وارتقار کا تو کیا، بقا وسالمیت کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا شرف ان ہی اربابِ عزیمت کو حاصل ہو سکتا تھا جو متاعِ زیست کا سودا کرنے کے لیے ہر آن آمادہ ہوں، جو موجِ حوادث سے مسکراتے ہوئے آگے نکل جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، جو ہر ناخوش گوار حالت میں بھی پیمانِ وفا نبھانے کا عزم رکھتے ہوں، آنحضرتؐ نے اس حقیقت کا اظہار کس قدر لطیف پیرایہ میں کیا ہے کہ "مدینہ کی مثال بھٹی کی سی ہے جو کھوٹ کو چھانٹ دیتی ہے اور جوہرِ خالص کو الگ کر دیتی ہے۔" [1]

حضرت عمرؓ ایک حج کے موقع پر ایک اہم سیاسی و دینی تقریر کرنا چاہتے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا، امیر المومنین! ایسی اہم تقریر کے لیے یہ موقع کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ حج میں ہر قسم کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور بالعموم اس قسم کے بازاری لوگ ہی مقرر کے اردگرد چھا جاتے ہیں اس سے ایک طرف تو اہلِ فقہ اور اربابِ بصیرت صحیح بات سن نہیں سکتے اور دوسری طرف عوام جن باتوں کو سنتے ہیں ان کی تہہ تک ان کی رسائی ممکن نہیں، وہ بات کو بلا سوچے سمجھے بے موقع منطبق کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا:

فَامْهِلْ حَتّٰى تَقْدَمَ الْمَدِيْنَةَ	مدینہ پہنچنے تک انتظار فرمائیے کیونکہ
فَاِنَّهَا دَارُ الْهِجْرَةِ وَالسُّنَّةِ	وہ دار الہجرت اور گہوارۂ سنت ہے
فَتَخْلُصَ بِاَهْلِ الْفِقْهِ	پس آپ وہاں اہلِ فقہ اور قوم کے
وَاَشْرَافِ النَّاسِ	سرداروں سے الگ خطاب کر سکتے
فَتَقُوْلَ مَا قُلْتَ مُتَمَكِّنًا	ہیں اور آپ اپنی مراد کو صحیح طور پر
فَيَعِيَ اَهْلُ الْعِلْمِ	پیش کر سکتے ہیں جسے اہلِ علم حضرات
مَقَالَتَكَ وَيَضَعُوْهَا عَلٰى	پوری طرح محفوظ رکھیں گے اور موقع

---

[1] بخاری فضائل المدینہ باب المدینۃ تنفی الخبث الخ۔

مَوَاضِعِهَا ۔ [1] و محل پر اس کا انطباق کر سکیں گے ۔

علامہ حافظ ابن حجرؒ اس واقعہ کی تشریح میں لکھتے ہیں :

"اس واقعہ سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ اہلِ مدینہ علم و فہم کے لیے مخصوص تھے کیونکہ اس بات پر عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عمرؓ جیسی اہم ہستیوں نے اتفاق کیا ہے، ابنِ بطالؒ کے بیان کے مطابق محدث مہلبؒ کی یہی رائے ہے، ابنِ بطال نے بھی اس رائے کی تاکید کی ہے ۔ ہمارے خیال میں بھی اس دور کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے ۔" [2]

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزمؒ کہتے ہیں "جب تم اہلِ مدینہ کو کسی معاملہ میں متفق دیکھو تو سمجھ لو کہ وہی حق ہے ۔" [3] یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی جس کے انکار کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا تھا، وہ بلوائی اور فتنہ باز جن کے ہاتھوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت پیا تھا ۔ ان کی نگاہوں سے تک یہ حقیقت اوجھل نہیں رہی چنانچہ وہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اہلِ مدینہ سے کہتے ہیں ۔

يَا أَهْلَ الْمَدِينَةِ أَنْتُمْ أَهْلُ الشُّورَىٰ وَأَنْتُمْ تَعْقِدُونَ الْإِمَامَةَ وَحُكْمُكُمْ جَائِزٌ عَلَى الْأُمَّةِ فَانْظُرُوا رَجُلًا وَنَحْنُ لَكُمْ تَبَعٌ ۔ [4]

اے اہلِ مدینہ تم لوگ اہلِ شوریٰ ہو اور تمھیں کو امامت کے انعقاد کا حق ہے اور تمہارا ہی حکم ساری اُمت پر جاری ہے لہٰذا کسی آدمی کو خلیفہ منتخب کرو ہم تمہارے پیچھے چلیں گے ۔

بلوائیوں کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا ۔ وہ اگر اپنے اقتدار اور قوت سے کسی کو

---

[1] بخاری کتاب المحاربین باب رجم الحبلیٰ من الزنیٰ اذا احصنت، مسند احمد حدیث نمبر ۳۹۱، تاریخ طبری ج ۳ ص ۲ [2] فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۲۶ [3] مختصر جامع بیان العلم وفضلہ ص ۲۰۰

[4] تاریخِ کامل ج ۳ ص ۸۱ ۔

خلیفہ منتخب کرتے تو اس پر اُمت کا اتفاق دشوار تھا، امت کے نزدیک وہی فیصلہ قابلِ قبول ہوسکتا تھا جس پر اہلِ مدینہ کی مہر لگی ہوئی ہو۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ اہلِ مدینہ یا بالفاظِ دیگر مہاجرین وانصار ہی اربابِ حل وعقد تھے تو ہم اس کے بعد اس دَور کے شورائی نظام کا تفصیلی مطالعہ کرسکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ مہاجرین کی قیادت اور انصار کے مشورہ سے کس حد تک سیاسی امور انجام پذیر ہوئے اور امیر کے اختیارات کن حدود میں محدود رہے۔

نبی کریمؐ کی شوریٰ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملکی مسائل کبھی تمام اہلِ مدینہ کے براہِ راست مشورے سے طے کرتے تھے اور کبھی گفتگو مہاجرین وانصار کے نمائندوں تک محدود رہتی، بنیادی اور اہم معاملات میں بالعموم پہلی صورت اختیار کی جاتی اور دوسری صورت بھی اہلِ مدینہ کی رضا کا باعث ہوتی۔

نمائندگانِ قبائل:

دَورِ جاہلیت کے قبائلی نظام میں ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا، اسلام نے اس نظام کو باقی رکھا اور مناسب اصلاح کے بعد اپنے اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کیا۔

جس وقت انصار نے بیعت عقبہ میں آنحضرتؐ کی حمایت ونصرت کا حلف اٹھایا تھا، اس وقت آپؐ نے انصار سے فرمایا کہ تم اپنے نمائندوں کو پیش کرو جو اپنی قوم کی تائید وحمایت کا ذمہ دار بنے، چنانچہ اسی وقت وفدِ مدینہ نے قبیلۂ خزرج کی مختلف شاخوں سے ۹ اور قبیلۂ اوس کے تین نمائندے پیش کیے جنہوں نے وفاداری ونصرت کا عہد کیا۔[1]

جنگِ ہوازن میں مالِ غنیمت اور بہت سارے قیدی عسکرِ اسلام کے ہاتھ آئے، اسلامی ضابطۂ جنگ کے مطابق ان قیدیوں کو فوج کے درمیان تقسیم کردیا گیا اور وہ غازیوں کی ملکیت قرار پائے، تقسیم کے بعد قبیلۂ ہوازن نے دربارِ رسالت میں اپنے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست غازیانِ اسلام کے توجہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ص۲۹۷ تاریخ کامل ج ۲ ص۴۰ ۔

رکھی اور اس سلسلہ میں سفارش فرمائی جس پر ساری فوج کی جانب سے آمادگی کا اظہار ہونے لگا لیکن اس سے واضح طور پر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون اس پر آمادہ ہے اور کون نہیں، اس لیے آپؐ نے فرمایا:

إِنَّا لَا نَدْرِي مَنْ أَذِنَ مِنْكُمْ فِي ذٰلِكَ مِمَّنْ لَمْ يَأْذَنْ فَارْجِعُوا حَتّٰى يَرْفَعَ إِلَيْنَا عُرَفَاؤُكُمْ أَمْرَكُمْ فَرَجَعَ النَّاسُ وَكَلَّمَهُمْ عُرَفَاؤُهُمْ ثُمَّ رَجَعُوا إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ فَأَخْبَرُوهُ أَنَّهُمْ قَدْ طَيَّبُوهُ۔ [1]	ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی لہٰذا آپ لوگ لوٹ جائیں اور ہمیں آپ کے سردار آپ کی مرضی سے مطلع کریں پس لوگ لوٹ گئے اور ان سے ان کے سرداروں نے گفتگو کی، بعد ازاں سردارانِ قبائل نے آنحضرتؐ کو اطلاع دی کہ وہ بخوشی اس پر آمادہ ہیں۔

اس واقعہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

ایک تو یہ کہ دورِ رسالت میں باقاعدہ عوام کے نمائندے پائے جاتے تھے۔

دوسری یہ کہ وہ عوام کے خیالات اور ان کی مرضی و ناراضی کے ترجمان ہوتے تھے۔

تیسری یہ کہ آنحضرتؐ قوم کے رجحانات سے واقف ہوئے بغیر کوئی اجتماعی فیصلہ نہیں فرماتے تھے۔

حدیث میں "عرفا" کا لفظ آیا ہے جو "عریف" کی جمع ہے اس کی شرح مشہور شارحِ حدیث امام خطابی المتوفی ۲۷۵ھ اس طرح کرتے ہیں:

اَلْعَرِيفُ الْقَيِّمُ بِأَمْرِ الْقَبِيلَةِ يَلِي أُمُورَهُمْ وَ	عریف قبیلہ کے نگران کو کہتے ہیں جو ان کے معاملات کی سرپرستی کرتا

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ ویوم حنین الخ، سیرت ابن ہشام ص ۸۷۶، ۸۸۸،

يَتَعَرَّفُ الْأَمِيرُ مِنْهُ أَحْوَالَهُمْ ۔ ہے اور امیر اس کے ذریعہ ان کے احوال سے واقف ہوتا ہے

قَالَ الشَّاعِرُ :

أَوَ كُلَّمَا وَرَدَتْ عُكَاظَ قَبِيلَةٌ
بَعَثُوا إِلَيَّ عَرِيفَهُمْ يَتَوَسَّمُ[1]

ہماری ان تصریحات کا مزید ثبوت ابوداؤد کی ایک روایت سے بھی ہوتا ہے، امام ابوداؤد نے ایک شخص کی زبانی دورِ رسالت کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ اور اس کے چشمے کا قیم اور ذمہ دار تھا۔ جب منادیٔ اسلام کی صدا اس کے گوش حق نیوش تک پہنچی تو اس نے اس صدا پر لبیک کہی اور اپنی قوم کو ایک سو اونٹ دے کر اسلام قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا لیکن ایک عرصہ بعد اس نے اپنے اونٹ واپس لے لینے کا ارادہ کیا اور اپنے اس ارادہ کی اطلاع اپنے ایک لڑکے کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ اس کے لڑکے کو اس کے بعد قبیلہ کا قیم بنا دیا جائے، آنحضرت نے پہلی درخواست منظور کرتے ہوئے فرمایا کہ تیرا باپ اگر اونٹ واپس لے لینا چاہے تو لے سکتا ہے کیونکہ اگر قبیلہ نے اسلام نہیں قبول کیا تو اس سے جنگ کی جائے گی۔ دوسری درخواست چونکہ روحِ اسلام کے منافی تھی اس لیے نہایت ہی لطیف انداز میں اس سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا:

إِنَّ الْعِرَافَةَ حَقٌّ وَلَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ عُرَفَاءَ وَلَكِنَّ الْعُرَفَاءَ فِي النَّارِ ۔[2]

قیمی حق ہے اور لوگوں کے لیے قیمین کا پایا جانا حد درجہ ضروری ہے لیکن قیمین دوزخ میں جائیں گے (اگر وہ قبائل کے حقوق کی رعایت نہ کریں)

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا کہ محض سیادت اور حکمرانی کے جذبہ سے قیم بن جانا اور فی الواقع اس کے استحقاق سے عاری ہونا ہلاکت و

---

[1] معالم السنن ج ۳ صہ ۲ ، [2] ابوداؤد اول کتاب الخراج والفئ والامارۃ باب فی العرافۃ۔

تباہی کا موجب ہے۔

عرب کے نظام میں جو سرداران قبائل ہوتے تھے ان کے اندر بعض ایسی بنیادی اخلاق صفات ہوتی تھیں، مثلاً جود و سخا، شجاعت، حمیت، ایثار و بے نفسی وغیرہ جن کی وجہ سے قبیلہ کے تمام افراد کی نگاہیں سرداری اور قیادت کے لیے اسی کی طرف اٹھتی تھیں اور ان کی سیرت و کردار پر قوم کو اس قدر اعتماد ہوتا تھا کہ وہ اس کے فیصلہ کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے، اسی خوبی کو موجودہ دور نے اپنے ہاتھوں ضائع کر دیا ہے اس کے نمائندے دون ہمت اور ناقابلِ اعتماد سیرت و اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں جن سے کسی بھی معاملہ میں بھلائی کی توقع فضول ہوتی ہے، قوم جن امیدوں کو ان کے ساتھ وابستہ رکھتی ہے ان حسین خوابوں کی تعبیر کبھی عالمِ واقعہ میں ظاہر نہیں ہوتی۔

اس وقت ایک واقعہ کا تذکرہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکے گا کہ عرب کے نظام میں سردارانِ قبائل کی کیا حیثیت تھی اور قوم ان پر کیوں اعتماد کرتی تھی پھر یہ کہ اسلام نے صرف نمائندوں کی رائے کو قوم کی رائے کا ہم معنی کیوں سمجھا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رض کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے پوچھا اے بنو مسلمہ تمہارا سردار کون ہے ہم نے جواب دیا، جد بن قیس لیکن ہم اس میں ایک نقص پاتے ہیں یہ کہ وہ بخیل ہے، اپنی دولت کو قوم کی فلاح و بہبود میں صرف نہیں کرتا۔ آنحضرت سن کر تعجب آمیز انداز میں فرمایا سردار اور بخیل ہو، بخالت سے بڑی بھی کوئی بیماری ہو سکتی ہے؟ آج سے تمہارے سردار عمرو بن الجموح رض ہو گئے۔"[1]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرداری کے لیے کن اوصاف کا پاس و لحاظ رکھا جاتا تھا اور آنحضرت نے ان اوصاف کو کس قدر اہمیت دی ہے اور ان اوصافِ عالیہ سے جو سردار عاری تھا اسے کس طرح اس کے منصب سے ہٹا دیا گیا۔

آیئے ہم ان ہی بنیادوں پر دورِ رسالت کے شورائی نظام کا ایک اجمالی نقشہ پیش

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر تذکرہ عمرو بن الجموح، الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ ص ۵۲۹ نمبر ۵۷۹۷،

کریں جس سے آپ صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نمائندگانِ قوم کی آنحضرتؐ کے نزدیک کیا قدر و قیمت تھی اور اجتماعی معاملات میں ان کا کتنا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

مشہور تابعی سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں :

"آنحضرتؐ کے پاس حضرت ابوبکرؓ کو ایک وزیر کا سا مرتبہ حاصل تھا جن سے آپ تمام معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے۔"[1]

غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ عرب جو روم و فارس کے نظامِ سلطنت سے واقف تھے حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرتؐ کا وزیر ہی کہا کرتے تھے[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں حضرت ابوبکرؓ سے امورِ مسلمین میں گفتگو فرماتے تھے اور میں بھی شریکِ گفتگو رہتا۔"[3]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بزرگوں کو کس طرح اپنا شریکِ کار بنائے رکھا تھا اس کا اندازہ آپ کی زندگی بھر کے رفیق حضرت علیؓ کے بیان سے کیجیے، فرماتے ہیں :

"بے شمار دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس قسم کے کلمات سنے ہیں، میں نے اور ابوبکرؓ و عمرؓ نے یہ کام کیا، فلاں مقام پر میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ گئے ہوئے تھے، فلاں مقام سے میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ واپس ہوئے۔"[4]

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ کہتے سنا کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو مختلف مقامات پر تعلیم کی غرض سے روانہ کیا تھا میری بھی خواہش ہے کہ اسی طرح میں بھی کچھ آدمیوں کو اطرافِ ملک میں بھیجوں تاکہ وہ دین کی تعلیم دیں یہ سن کر کسی نے کہا کہ کیوں نہ آپ اس کام پر ابوبکرؓ و عمرؓ کو لگا دیں۔ آپ نے جواب دیا "میں ان دونوں کو دور نہیں بھیج سکتا، اس دین کے معاملات میں ان کی حیثیت سمع و بصر کی سی ہے اس لیے میں ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔[5]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ صـ ۶۳ ، [2] مقدمہ ابنِ خلدون صـ ۲۰۶ ، [3] مسند احمد حدیث نمبر ۱۷۸، ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی الرخصۃ فی السمر بعد العشاء ، [4] مشکوٰۃ کتاب المناقب بحوالہ صحیحین ، [5] مستدرک حاکم ج ۳ صـ ۷۴ ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سرداران امت کے مشورہ کو کیا اہمیت دیتے تھے اسے خود زبانِ رسالت مآبؐ کے الفاظ میں سنیئے:

لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِي مَشُوْرَةٍ	اگر تم دونوں کسی معاملہ پر متفق ہو جاؤ
مَا خَالَفْتُكُمَا ۔[1]	تو میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔

حدیث اور تاریخ کے صفحات شہادت دیتے ہیں کہ وزیر کی حیثیت صرف مذکورہ بالا دونوں ہی بزرگوں کے ساتھ مختص نہیں تھی بلکہ اس حیثیت میں تمام اکابر و اعیانِ ملت شریک تھے حضرت علیؓ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ موسیٰؑ کے نزدیک ہارونؑ کی جو پوزیشن تھی وہی حیثیت تمہاری میرے نزدیک ہے[2]۔ گو کہ یہ قول ایک خاص پس منظر میں ارشاد ہوا ہے لیکن اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایک اور مرکزی شخصیت کے تعینِ مرتبہ و مقام میں مدد ملتی ہے، طائف کی جنگ کے موقع پر آپؐ نے حضرت علیؓ سے تنہائی میں گفتگو فرمائی تو اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ آنحضرتؐ ہمیں چھوڑ کر اپنے چچازاد بھائی سے ہم کلام ہیں آپؐ نے یہ سن کر جواب دیا کہ "اللہ نے مجھے اس سے سرگوشی کا حکم دیا ہے[3]" یعنی وہ مستحقِ رازداری ہیں اور اہم معاملات میں ان سے گفتگو کرنا منشاءِ الٰہی کے عین موافق ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ جنگِ خندق میں آنحضرتؐ نے جب یہ محسوس کیا کہ مشرکین کے اس ٹڈی دل لشکر سے فی الحال نبٹنا دشوار ہے اس لیے قبیلۂ غطفان کے سرداروں سے اس شرط پر صلح کرنی چاہی کہ مدینہ کی فصل کا ایک خاص حصّہ سالانہ انہیں دیا جائے لیکن جب سردارِ انصار سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ اس پر آمادہ نہیں ہوئے تو صلح نامہ چاک کر دیا گیا[4]۔

اس قسم کی اور بھی بہت ساری تصریحات پیش کی جا سکتی ہیں کہنے کا منشا صرف اس قدر ہے، کہ دورِ رسالت میں باضابطہ اربابِ حل و عقد موجود تھے جن سے آپؐ ہمیشہ مشورہ فرماتے تھے، آنحضرتؐ کے شب و روز کے ایک رفیق حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

---

[1] روح المعانی ج ۴ ص ۱۰۶ بحوالہ مسند احمد، [2] بخاری کتاب المناقب، [3] مشکوٰۃ کتاب المناقب بحوالہ ترمذی، [4] تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۸ ۔

مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ مَشُوْرَةً مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

طباطبائی لکھتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يُشَاوِرُ أَصْحَابَهٗ دَائِمًا۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے ہمیشہ مشورہ کیا کرتے تھے۔

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

فَكَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُشَاوِرُ أَصْحَابَهٗ وَيُفَاوِضُهُمْ فِيْ مُهِمَّاتِهِ الْعَامَّةِ وَالْخَاصَّةِ وَيَخُصُّ مَعَ ذٰلِكَ أَبَا بَكْرٍ بِخُصُوْصِيَّاتٍ أُخْرٰى۔ [3]

آنحضرتؐ صحابہ سے اپنی عام و خاص مہمات میں مشورہ فرماتے تھے اور صحابہ میں بھی حضرت ابوبکرؓ سے خاص طور پر مشورہ کرتے تھے کیونکہ ان کے اندر بعض مخصوص خصوصیتیں تھیں جو اوروں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔

چند مثالیں:

جب تک کہ تحریک اسلامی مکہ کی تنگنائیوں میں محصور رہی اس وقت تک اسے ہیئتِ اجتماعی نصیب نہیں ہوئی، مسلمانوں کے ہاتھوں میں اتنا تمکن و اقتدار ہی نہیں تھا کہ وہ خدا کی نازل کردہ ہدایت کے ذریعہ منظم اجتماع کی تعمیر و تشکیل کریں، اسی لیے اجتماعی زندگی کی تفصیلات ہمیں مکی زندگی کے اوراق میں نہیں ملتی گو کہ تاریخ ہماری اس قدر رہنمائی کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ

---

[1] امام ترمذی نے اس حدیث کو بلا سند نقل کیا۔ باب ما جاء فی المشورۃ لیکن امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے سند پیش کی ہے گو کہ اس میں ارسال ہے لیکن فقہاء و محدثین نے جس کثرت سے اس روایت کو قبول کیا ہے اس سے یہ نقص بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔

[2] الفخری ص ۱۷، [3] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۶

دارِ ارقم میں مجتمع ہوئے تھے اور دینِ حق کی تعلیمات حاملِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرتے تھے اسی کے ساتھ یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ ان اجتماعات میں خدا کے دین کے فروغ اور سربلندی کے لیے بھی اجتماعی غور و فکر ہوتا ہوگا لیکن افسوس کہ آج سیر و تذکرہ کی کتابوں سے یہ زریں اوراق مفقود ہیں۔

لیکن جب سرزمینِ مدینہ نے دعوتِ اسلامی کے لیے اپنا سینہ کھول دیا تو مسلمانوں کو کھلی فضا میں اپنے نصب العین اور نظریہ کے مطابق ایک ریاست کی داغ بیل ڈالنے کا موقع ملا، تاریخ نے اس دَور کے تمام اہم واقعات کو آئندہ کے مسافرانِ راہِ حق کے لیے سنگِ میل کے طور پر محفوظ رکھا ہے۔

اس مقام پر ہم چند قومی و اجتماعی فیصلوں کا تجزیہ کر کے دکھانا چاہتے ہیں کہ اس دَور کا نظام کس قدر شورائی اور جمہوریت نواز تھا۔

ا۔ واقعۂ بدر:

ہجرت کے دو ہی سال بعد معرکۂ بدر قائم ہوا جو اسلامی تاریخ میں بہت ہی اہم اور دُور رس نتائج کا حامل رہا ہے۔ تاریخ کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس اہم اور فیصلہ کن معاملہ کی طرف اقدام باہمی مشورہ اور قوم کی تائید حاصل کر لینے کے بعد کیا گیا۔ یہاں یہ دعوٰے کرنے کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمائندگانِ قوم کو نظر انداز کر کے محض اپنی ذاتی رائے سے کوئی فیصلہ کر لیا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ کے تمام نشیب و فراز کو قوم کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا کہ شام سے ابوسفیان کا تجارتی قافلہ آ رہا ہے، ساتھ ہی اس بات کا قوی امکان ہے کہ قافلہ کی حفاظت کے لیے مکہ کی ساری عسکری قوت میدان میں کُود پڑے، مجھ سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ پرستارانِ حق کا ان دونوں میں سے کسی ایک سے مقابلہ ہو کر رہے گا، اگر قافلہ سے مقابلہ ہوا تو مالِ غنیمت لے کر لوٹیں گے اور دشمنانِ حق کی مالی پوزیشن کو بڑی حد تک کمزور کر سکیں گے، لیکن اگر قریش کی فوج سے ٹکراؤ ہو گیا تو یہ حق و باطل کی پنجہ آزمائی ہوگی جس میں یقین ہے فتح و نصرت کا پرچم حق کے ہاتھ میں ہوگا اور پرچم باطل سرنگوں ہوگا۔

یہ سُن کر حضرت ابوبکرؓ (جنہیں ہم مہاجرین کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں) نے تقریر کی اور کہا کہ

ہم میدانِ جنگ کی طرف سربکف نکلنے کے لیے تیار ہیں اور خدا کے دین کی حفاظت کے لیے ہمارے آخری قطرۂ خون کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ تو ہماری سعادت و سرخروئی ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اور دیگر نمائندگانِ مہاجرین نے آنحضرتؐ کے ارادے کی تائید کی۔

ان عزم سے بھرپور اور حوصلہ افزا تقریروں کے سننے کے باوجود آنحضرتؐ کا روئے سخن کسی اور ہی طرف تھا۔ آپؐ انصار کے عندیہ سے واقف ہونا چاہتے تھے کیونکہ ایک تو کثرت ان ہی کی تھی اور دوسرے یہ کہ انصار نے حمایت کا وعدہ مدینہ پر فوج کشی کی صورت میں کیا تھا، مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا ان پر ضروری نہیں تھا لیکن جب انصار نے محسوس کیا کہ ذاتِ اقدسؐ کا خطاب ہم ہی سے ہے تو نمائندگانِ انصار نے ارادۂ نبوی کی پُرزور حمایت کی اور کہا کہ حضورؐ حکم دیں تو ہم سمندر کا سینہ چیر کر آگے نکل جائیں، ہم حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ جواب نہیں دے سکتے کہ جاؤ تم اور تمہارا رب دشمن سے مقابلہ کرو، ہم میں تابِ نبرد آزمائی نہیں۔

ان پرجوش کلمات کے بعد آنحضرتؐ نے اپنی رائے کو آخری شکل دی، اس طرح قوم کے اجتماعی فیصلہ سے معرکۂ بدر قائم ہوا۔[1]

۲۔ میدانِ جنگ کا انتخاب:

میدانِ بدر میں جب فوج پڑاؤ ڈال چکی تو حباب بن منذرؓ نے آنحضرتؐ سے دریافت فرمایا کہ یہ مقام جہاں کہ فوج اس وقت خیمہ زن ہے کیا اس کا تعین زبانِ وحی نے کیا ہے یا جنگی تدبر اور آپ کی رائے اس کی باعث ہوئی ہے اگر پہلی صورت ہے تو ہم مجالِ دم زدن نہیں رکھتے لیکن اگر دوسرا پہلو ہے تو جنگی تدابیر مقتضی ہیں کہ ہم پانی کے چشموں پر قبضہ کرلیں تاکہ قریش ضرورت پر پانی نہ پا سکیں۔ حضورؐ نے یہ سن کر جواب دیا کہ تم نے بہت صحیح رائے دی ہے چنانچہ اسی رائے کے مطابق عمل ہوا[2]

اس سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوئی کہ امورِ رسالت کے علاوہ بقیہ تمام اجتماعی معاملات میں صحابہ کو

---

[1] مسلم باب غزوۂ بدر، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ہم نے ان ہی روایات کو لیا ہے جو مسلم کے اجمال سے مطابقت رکھتی ہیں، [2] سیرت ابن ہشام ص ۴۳۹ ، البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۶۷۔

رائے دینے کا حق حاصل تھا۔

۳ ۔ ابو العاص کا فدیہ[1] :

جنگِ بدر نے مسلمانوں کے حق میں کامیابی کا اعلان کیا اور مشرکینِ مکہ کی سیاہ تاریخ میں ایک اور صفحہ کا اضافہ ہوا مسلمانوں کو بہت سا مال اور ستر (۷۰) قیدی ہاتھ آئے، ان قیدیوں میں سے آنحضرتؐ کے داماد ابو العاص بھی تھے جنھوں نے تا اُس دم اسلام قبول نہیں کیا تھا اسی وجہ سے آنحضرتؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ اسلام لانے کے باوجود ابو العاص کے ماتحت مکہ ہی میں تھیں، جب حضرت زینبؓ کو اپنے شوہر کی گرفتاری کی اطلاع ملی اور یہ بھی کہ بغیر فدیہ کے کسی کو رہا نہیں کیا جا رہا ہے تو حضرت زینبؓ نے فدیہ میں وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں انہیں دیا تھا اس ہار کے دیکھنے کے بعد آنحضرتؐ پر بے انتہا تاثر اور عجیب رقت کا عالم طاری ہو گیا۔ حضرت خدیجہؓ اور لختِ جگر حضرت زینبؓ کی یاد نے آپؐ کو بے حد متاثر کیا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ ہار حضرت زینبؓ ہی کو واپس کر دیں لیکن چونکہ یہ عام مسلمانوں کی ملکیت بن چکا تھا اس لیے آپؐ کو صحابہ سے اجازت لینی پڑی آپ نے صحابہ سے فرمایا اگر تم بہتر سمجھو تو ابو العاص کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا جائے اور یہ ہار زینبؓ کو واپس کر دیا جائے صحابہ بخوشی اس پر آمادہ ہو گئے اور ہار واپس کر دیا گیا۔[2]

۴ ۔ غزوۂ اُحد :

غزوۂ اُحد کے موقع پر آنحضرتؐ کی پالیسی نے شوریٰ کی اہمیت اور اس کی قانونی حیثیت کو بے میل اور نکھار کر رکھ دیا ہے۔ جس وقت آنحضرتؐ کو یہ اطلاع ملی کہ قریش کا بے پناہ لشکر پورے جوشِ انتقام کے ساتھ مدینہ کی طرف رُخ کر رہا ہے تو آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور آپؐ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں رہ کر باہر سے حملہ آور دشمن کا مقابلہ کیا جائے چنانچہ اس کا تفصیلی نقشہ بھی آپؐ نے صحابہ کے رُوبرُو پیش کیا تھا لیکن صحابہ کی اکثریت نے آپؐ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جس

---

[1] اس ضمن میں بدر کے قیدیوں کے عدم ذکر سے تعجب ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی بعض تفصیلات سے ہمیں ابھی تک اطمینان نہیں ہوا ہے اس لیے یہاں پیش نہیں کیا گیا۔

[2] سیرت ابن ہشام صفحہ ۴۶۵، ۴۶۶، البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۳۱۲۔

میں خصوصیت سے وہ لوگ جو کسی وجہ سے ثوابِ بدر سے محروم رہ گئے تھے بہت پیش پیش تھے، اور شوقِ جہاد اور باطل کی سرکوبی کے ولولہ میں بار بار کہتے تھے اگر ہم میدانِ جنگ میں تلوار کے ذریعہ دینِ حق کی حفاظت نہیں کر سکتے اور اپنے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو پھر کیا کر سکیں گے؟ ہم اسی دن کے دل و جان سے متمنی تھے اور خدا سے اس دن کے لیے التجا کرتے تھے۔ پس جب یہ موقع آیا ہے تو اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔

حافظ ابن کثیرؒ روایت نقل کرتے ہیں:

وَاَبٰی کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ اِلَّا الْخُرُوْجَ
اِلَی الْعَدُوِّ وَلَمْ یَتَنَاهَوْا اِلٰی
قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَرَاْیِهٖ[1]

اکثریت مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے
پر مصر تھی اور انہوں نے آنحضرتؐ
کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمہور کی رائے کو اپنی رائے کے خلاف پایا تو آپؐ نے اپنی رائے تبدیل فرمالی اور خارجِ مدینہ چل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور گھر سے فوجی لباس میں نمودار ہوئے۔ اتنے میں بعض اربابِ فہم و بصیرت نے خیال کیا کہ شاید ہمارا یہ مشورہ مرضیٔ خداوندی کے خلاف پڑتا ہے، اور اگر خدانخواستہ ایسی کوئی صورت ہو تو یہ ایک افسوسناک اور تباہ کن بات ہوگی۔ اس لیے آنحضرتؐ ہی کی رائے پر عمل کیا جائے۔

فَلَمَّا رَاٰی ذٰلِکَ رِجَالٌ
مِنْ ذَوِی الرَّاْیِ قَالُوْا
اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اَنْ
تَمْکُثَ بِالْمَدِیْنَةِ وَ
هُوَ اَعْلَمُ بِاللّٰهِ وَمَا
یُرِیْدُ وَیَاْتِیْهِ الْوَحْیُ
فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

آنحضرتؐ کے تیار ہو جانے کے بعد بعض
اصحاب رائی نے کہا کہ آنحضرتؐ نے مدینہ
ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کا حکم دیا تھا (ہم
نے آپ کی رائے کے خلاف مشورہ دیا،
نہیں معلوم کہ ہمارا یہ مشورہ کسی حکمِ الٰہی کے
خلاف پڑتا ہو) اس لیے آنحضرتؐ (اللہ
اور اس کے ارادوں سے زیادہ واقف

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۴ صـ ۱۲

اُمْكُثْ كَمَا اَمَرْتَنَا ۔ له ہیں) آپ کے پاس وحی آتی ہے، آپ کی رائے وحی ہی پر مبنی ہو گی، چنانچہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کیا جائے جیسا کہ آپ کا حکم تھا۔

ظاہر ہے کہ صحابہ کی رائے میں یہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہ مدینہ سے باہر چل کر مقابلہ کرنا منافی حکمت و دانشمندی سمجھنے لگے تھے بلکہ اس تبدیلی کی واحد علت محض یہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ حکم بر بنائے وحی نہ دیا گیا ہو، اس وجہ سے آنحضرتؐ نے جواب دیا کہ نبی جب اپنا جنگی لباس پہن لیتا ہے تو جنگ کیے بغیر اسے نہیں اتارتا۔ یعنی وہ فیصلہ سے پہلے مشورہ کرتا ہے۔ مشورہ کے بعد جب کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے تو محض غلط فہمیوں اور بے بنیاد باتوں پر اپنی رائے نہیں تبدیل کرتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اگر مذکورہ بالا رائے محض اندیشہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ جنگی مصالح کے تحت پیش کرتے تو جس طرح نبی کریمؐ نے اپنی پہلی رائے بدل دی تھی اسی طرح دوبارہ بھی بدل سکتے تھے۔

۵۔ جنگِ خندق:

خندق کی جنگ دراصل تمام قبائلِ عرب سے مقابلہ کے مترادف تھی اور اس میں مٹھی بھر مسلمانوں کے لیے رُو در رُو مقابلہ کوئی آسان کام نہیں تھا اس لیے حضرت سلمانؓ فارسی نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا تاکہ مدینہ پر مشرکین کا یہ ٹڈی دل لشکر یلغار نہ کر دے۔ چنانچہ حضرت سلمانؓ کے مشورے کے مطابق مدینہ کے چاروں طرف خندق کھودی گئی۔ له

باایں ہمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ محسوس کیا کہ صحرائے عرب کی ہر جانب سے اٹھا ہوا یہ طوفان آسانی کے ساتھ فرو نہیں ہو سکتا تو آپؐ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس جمعیت سے قبیلۂ غطفان کو توڑ لیا جائے چنانچہ آپؐ نے قبیلۂ غطفان کے سرداروں (عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف) سے اس شرط پر صلح کرنی چاہی کہ ان کا قبیلہ مسلمانوں کی جنگ سے باز آئے اور مسلمان اس کے عوض سالانہ مدینہ کی آدھی فصل انہیں دے دیں گے۔ تکمیلِ صلح سے قبل آپؐ نے مشورہ ضروری سمجھا اور سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ سے رائے لی انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ حکم منجانب اللہ

له البدایة والنہایة ج ۴ ص ۱۳ ، سیرت ابن ہشام ص ۵۵۸ ، ۲ه طبری ج ۳ ص ۴۴ ۔

ہے یا آپؐ نے اسے ہمارے حق میں بہتر سمجھ کر اختیار فرمایا ہے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ میں اپنی رائے کو تمہارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت عرب کے تمام قبائل تمہیں ایک ہی تیر سے ہدف بنائے ہوئے ہیں اور تم پر درندوں کی طرح ہر طرف سے ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں، اگر میری رائے کے مطابق قبیلۂ غطفان کو مشرکین سے توڑ لیں تو ان کا شیرازہ پارہ پارہ ہو سکتا ہے۔

یہ سن کر سعد بن معاذؓ نے جواب دیا کہ ایک وہ دور تھا جب ہم جہالت کی ظلمتوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے اور ہمارے پاس دینِ حق کی کوئی روشنی نہیں تھی اس کے باوجود یہ قبائل بزور ہم سے ایک کھجور نہیں لے سکتے تھے اور آج جب کہ خدا نے ہمیں حق کی دولت سے نوازا ہے اور صداقتِ ایمان کی قوت عطا فرمائی ہے انہیں جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں؟ ہمارے درمیان تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب سن کر معاہدہ چاک کر دیا۔ [1]

اس واقعہ کو علامہ ابنِ عبدالبر المتوفی ۴۶۳ھ نے جن الفاظ کے ساتھ محفوظ کیا ہے ان سے ہماری پوری بحث کو خاص تقویت پہنچتی ہے۔

فَارْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلٰی	رسولؐ اللہ نے اپنا قاصد تمام انصار کے
سَعْدِ بْنِ مَعَاذٍ وَسَعْدِ بْنِ	کے بجائے صرف سعد بن معاذؓ اور
عُبَادَةَ دُوْنَ سَائِرِ الْاَنْصَارِ	سعد بن عبادہؓ کے پاس بھیجا کیونکہ یہ
لِاَنَّهُمَا كَانَا سَيِّدَ	دونوں اپنے اپنے قبیلے کے سردار تھے
كَانَ سَعْدٌ سَيِّدَ الْاَوْسِ	سعد بن معاذؓ اوس کے سردار تھے اور
وَسَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ سَيِّدَ	سعد بن عبادہؓ خزرج کے، آپؐ نے
الْخَزْرَجِ فَشَاوَرَهُمَا فِي	ان دونوں سے اس معاملہ میں مشورہ کیا اور
ذٰلِكَ فَقَالَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ	ان دونوں نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر آپ
اِنْ كُنْتَ اُمِرْتَ بِشَيْءٍ	کو اس کا حکم دیا گیا ہے تو اس میں مشورہ کی
فَافْعَلْهُ وَامْضِ لَهٗ وَاِنْ	کیا ضرورت ہے آپؐ کر گزریے۔ لیکن

---

[1] طبری ج ۳ ص ۴۸، کتاب الخراج ص ۲۴۶

كَانَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَوَاللّٰهِ لَا نُعْطِيهِمْ إِلَّا السَّيْفَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ لَمْ أُومَرْ بِشَيْءٍ لَوْ أُمِرْتُ بِشَيْءٍ مَا شَاوَرْتُكُمَا قَطُّ وَإِنَّمَا هُوَ رَأْيٌ أَعْرِضُهُ عَلَيْكُمَا فَقَالَا وَاللّٰهِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا طَمِعُوا بِذٰلِكَ مِنَّا قَطُّ ۔ [1]

اگر یہ حکم نہیں ہے تو قسم بخدا ہم تلوار ہی سے ان کا فیصلہ کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا مجھے اللہ نے اس معاملہ میں کوئی حکم نہیں دیا ہے اگر مجھے حکم ملا ہوتا تو تم سے مشورہ کیوں کرتا۔ یہ تو میری ایک رائے ہے جسے میں تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں تو ان دونوں نے جواب دیا واللہ یا رسول اللہ ان لوگوں نے کبھی بھی ہم سے اس قسم کے جزیہ کی توقع نہیں کی تھی۔

اس بیان سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے من جانب اللہ کوئی حکم نہیں ہوتا آپؐ اپنی رائے کو رائے ہی کی حد تک رکھتے تھے۔ انتظامی قسم کے معاملات میں آپؐ کی رائے کے خلاف کسی دوسری رائے کا اظہار نہ صرف جائز تھا بلکہ بسا اوقات ضروری خیال کیا جاتا تھا اور یہ کہ نبی ایسے تمام معاملات میں اپنی انفرادی رائے کو بجبر مسلط نہیں فرماتے تھے۔

۶۔ غزوۂ طائف:

قبیلۂ ثقیف اپنی قوت و توانائی اور مستحکم قلعوں کی وجہ سے طائف کا ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ شوال ۸ھ کو اسلامی فوج نے اس کا محاصرہ کیا، لیکن محارب قبیلہ نے میدان کارزار میں دوبدو نبرد آزما ہونے کے بجائے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرنا شروع کیا، اس لیے مسلمانوں کو کامیابی دشوار ہو گئی۔ یہ کیفیت دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کے مشورہ سے محاصرہ ختم کر دینا چاہا اور اپنی رائے صحابہ کے سامنے پیش کی، لیکن صحابہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور عرض پرداز ہوئے کہ اس قدر سعی و کاوش کے بعد فتح و کامرانی کا علم بلند کیے بغیر واپسی نہ کی جائے، اکثریت کی رائے

---

[1] استیعاب لابن عبد البر تذکرہ سعد بن عبادہ۔

معلوم ہو جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ حملہ کی اجازت دے دی۔ چنانچہ دوسرے دن حملہ ہوا لیکن کل سے بھی خراب نتیجہ سامنے آیا اور اسلامی فوج کو بہت نقصان اٹھانا پڑا، یہ دیکھ کر نبی کریمؐ نے پھر اپنی رائے کا اعادہ فرمایا، چونکہ اب صحابہ کے رُوبرُو نبیؐ کی وقیع رائے کے واضح نتائج روزِ روشن کی طرح کھل کر آگئے تھے اس لیے صحابہ نے بھی آپ کی ہمنوائی کی اور اسلامی فوج واپس ہوئی۔[1]

۷۔ واقعۂ افک :

مشہور واقعہ ہے کہ بعض منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان تراشا تھا جس کے ذریعہ ایک طرف آنحضرتؐ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عائشہؓ جیسی بے داغ اور پاکیزہ سیرتوں پر گندگی اچھالنے کی سعی کی جا رہی تھی اور دوسری طرف مسلم سوسائٹی کے بخیے ادھیڑنے کی فکر ہو رہی تھی۔ یہ ناپاک سعی اس قدر شدت کے ساتھ جاری تھی کہ اس کی لپیٹ میں بعض نیک و سادہ لوح مسلمان بھی آگئے اندریں احوال اس مسئلہ کا ایک اجتماعی مسئلہ کی شکل اختیار کر لینا ناگزیر تھا، آنحضرتؐ نے انفرادی رائے و مشورہ کے بعد انصار و مہاجرین سے دریافت کیا کہ ان نازک حالات میں کیا تدابیر اختیار کی جائیں لیکن پوری قوم اور خصوصیت سے انصار کی دو پارٹیوں اوس و خزرج میں اتفاق ہونے سے قبل آسمانی اشارہ نے اس عقدے کو حل کر دیا اور اجتماعی فیصلہ کی نوبت نہیں آئی۔[2]

دورِ رسالت کے یہ چند نمایاں اور معروف واقعات ہیں جن میں سے ہر ایک واقعہ کو آخری شکل قوم کی متفقہ رائے ہی سے دی گئی ہے بلکہ بسا اوقات نبی کریمؐ نے قوم کی رائے کے سامنے آجانے کے بعد اپنی رائے کو تبدیل بھی کر دیا ہے۔

---

[1] بخاری، مسلم غزوۂ طائف، تفصیل ملاحظہ ہو زرقانی علی المواہب ج ۳ ص۲۸ تا ص۳۵

[2] صحیح بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ لولا اذ سمعتموہ الخ

بابِ سوم

خلفائے راشدین کے دور میں شوریٰ کا نظام

عس

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک اسوہ سے آگاہی کے بعد، آئیے خلفائے راشدین کے تعامل کا بھی جائزہ لے دیکھیں کیونکہ ایک مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود کے بعد اسی دور کو قابلِ تقلید اور نمونہ عمل خیال کرتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کی جو تشریح اس سے پہلے مخاطبین نے سمجھی اور آنحضرتؐ کے عمل کو آپ کے براہِ راست تلامذہ نے جو اہمیت دی اور کتاب اللہ اور اس کے شارح کی ہدایات کی جو تعبیر کی وہی معتبر اور صحیح ہو سکتی ہے، اگر اس دور نے کسی طریقہ کو اہمیت دی ہے تو لامحالہ وہ دین کا قابلِ اہتمام طریقہ قرار پائے گا، جس عمل کو انہوں نے وقیع اور باعظمت نہ سمجھا ہو یقیناً دین میں اس کی اہمیت فروتر قرار پائے گی۔ اسی روشنی میں نظامِ شوریٰ کا بھی مطالعہ کرنا پڑے گا۔

حَدَّثَنَا مَيْمُوْنُ بْنُ مِهْرَانَ قَالَ كَانَ اَبُوْبَكْرٍ اِذَا وَرَدَ عَلَيْهِ الْخَصْمُ نَظَرَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ وَجَدَ فِيْهِ مَا يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ قَضٰى بِهٖ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَعَلِمَ

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو آپ پہلے کتاب اللہ میں اس کا حل تلاش کرتے، اگر وہاں اس کا حل مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے لیکن اگر کتاب اللہ میں کوئی حل نہ ملتا اور اس مسئلہ میں آپ

مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِیْ ذٰلِكَ الْاَمْرِ سُنَّةً قَضٰی بِهٖ فَاِنْ اَعْیَاهُ خَرَجَ فَسَأَلَ الْمُسْلِمِیْنَ وَقَالَ اَتَانِیْ كَذَا وَكَذَا فَهَلْ عَلِمْتُمْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَضٰی فِیْ ذٰلِكَ بِقَضَاءٍ فَرُبَّمَا اجْتَمَعَ اِلَیْهِ النَّفَرُ كُلُّهُمْ یَذْكُرُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِیْهِ قَضَاءً فَیَقُوْلُ اَبُوْبَكْرٍ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْنَا مَنْ یَّحْفَظُ عَلٰی نَبِیِّنَا فَاِنْ اَعْیَاهُ اَنْ یَّجِدَ فِیْهِ سُنَّةً مِّنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ جَمَعَ رُؤُسَاءَ النَّاسِ وَخِیَارَهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ فَاِذَا اجْتَمَعَ رَأْیُهُمْ عَلٰی اَمْرٍ قَضٰی بِهٖ وَكَانَ عُمَرُ یَفْعَلُ ذَالِكَ فَاِذَا اَعْیَاهُ اَنْ یَّجِدَ ذٰلِكَ فِی الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ سَأَلَ هَلْ كَانَ اَبُوْبَكْرٍ قَضٰی فِیْهِ بِقَضَاءٍ فَاِنْ كَانَ لِاَبِیْ بَكْرٍ قَضَاءٌ قَضٰی بِهٖ وَاِلَّا جَمَعَ عُلَمَاءَ النَّاسِ وَاسْتَشَارَهُمْ فَاِذَا اجْتَمَعَ رَأْیُهُمْ عَلٰی

کو کسی سنت کا علم ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر اس سلسلہ میں آپ کو کوئی ہدایت معلوم نہ ہوتی تو صحابہ سے کہتے کہ فلاں مسئلہ پیش آیا ہے کیا تمہارے علم میں اس سلسلہ میں خدا کے رسول کا کوئی فیصلہ ہے؟ بسا اوقات صحابہ کی ایک جماعت کی، جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت بیان کرتی جس سے آپ خوش ہو کر فرماتے خدا کا شکر ہے کہ ہم میں اب تک رسول اللہ کی سنت کو یاد رکھنے والے موجود ہیں۔ لیکن اگر آپ کو اس طریقے سے بھی کسی سنت کا علم نہ ہوتا تو قوم کے نمائندوں اور ان کے اخیار کو جمع کر کے مشورہ کرتے اور ان کی متفقہ رائے سے فیصلہ فرماتے، حضرت عمرؓ کی بھی یہی روش رہی۔ حضرت عمرؓ کو جب کسی مسئلہ کا حل کتاب و سنت میں نہ ملتا تو صحابہ سے ابوبکرؓ کا فیصلہ دریافت فرماتے۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے ورنہ ارباب علم کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب اہل علم کسی نتیجہ پر متفق

شَيْءٌ قَضَى بِهٖ[1] ہو جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔

یہ سردارانِ قوم اور خیارِ اُمت متعین اور مخصوص افراد تھے جن سے عوام واقف ہوتے تھے، ایسا نہیں تھا کہ خلیفہ جسے چاہتا طلب کر لیتا اور ان سے مشورہ کر کے حسبِ منشا فیصلہ کر دیتا ہو۔ علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

"خلفائے راشدین اور ان کے عادل جج، قوم کے سرداروں، دینی بصیرت رکھنے والوں اور اہلِ علم ورائے سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہی "اولوالامر" ہیں، بس انہیں وہ ضرورت کے وقت طلب کر لیتے۔"[2]

تاریخ نے کسی حد تک ان اربابِ علم اور سردارانِ قوم کے نام محفوظ رکھے ہیں جن پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر ہم ان کی سیاسی پوزیشن متعین کر سکتے ہیں۔

قاسمؒ کہتے ہیں کہ:

"حضرت ابوبکرؓ کے سامنے کوئی ایسا اہم معاملہ پیش ہوتا جس میں اہل الرائے اور اربابِ فقہ وبصیرت سے مشورہ کرنے کی ضرورت پڑتی تو مہاجرین وانصار کے منتخب لوگوں کو مدعو کرتے جن میں عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے لوگ شامل ہوتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے زمانے میں مختلف مسائل میں مرجع انام سمجھے جاتے تھے، یہی طریقہ حضرت عمرؓ کا بھی رہا۔"[3]

علامہ ابنِ خلدون لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے دور میں حضرت ابوبکرؓ کی جو پوزیشن تھی وہی پوزیشن حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں حاصل تھی، حضرت عمرؓ کی خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کو یہی مقام حاصل تھا۔[4]

ابنِ سعد نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے روایت نقل کی ہے کہ "حضرت عمرؓ کسی

---

[1] سنن دارمی ص۳۰، السنن الکبریٰ ج ۱۰ ص۱۱۵ اعلام الموقعین ج ۱ ص۵۱، ۵۲ بحوالہ کتاب القضاء لابی عبید۔ [2] تفسیر المنار ج ۵ ص۱۸۷ [3] کنز العمال ج ۳ ص۱۳۴

[4] مقدمہ ابنِ خلدون ص۲۰۶۔

ایسے پیچیدہ مسئلہ سے پناہ مانگتے تھے جس میں حضرت علیؓ انہیں مشورہ دینے کے لیے شریک نہ ہو سکتے ہوں"۔ [1]

آنحضرت کے عم محترم حضرت عباسؓ کو زمانہ اسلام اور قبل اسلام میں جو مقام حاصل رہا ہے وہ بالکل آشکارا ہے، اس سردارِ قوم کو فاروقی دورِ سیاست میں کیا مقام حاصل تھا اس کا اندازہ ایک تاریخی بیان سے کیجئے۔

وَکَانَ عُمَرُ اِذَا اسْتَشَارَ اَحَدًا	حضرت عمرؓ کسی سے مشورہ کرتے تو
لَا یُبْرِمُ اَمْرًا حَتّٰی یُشَاوِرَ	حضرت عباسؓ سے مشورہ کے بعد ہی
الْعَبَّاسَ [2]	اسے آخری شکل دیتے۔

حضرت عمرؓ کو جب کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہوتا تو عبداللہ بن عباسؓ سے فرماتے۔

"ابن عباسؓ اس قسم کے مشکل مسائل کا حل کرنا تمہارا ہی حق ہے"! [3]

دورِ صحابہ کے مشہور عالم قرآن حضرت ابی بن کعبؓ کے تذکرہ میں علامہ حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں:

وَکَانَ یَسْاَلُہٗ عَنِ	یعنی حضرت عمرؓ ابی بن کعبؓ سے
النَّوَازِلِ وَیَتَحَاکَمُ اِلَیْہِ	پیش آمدہ مسائل کے حل فرماتے اور مشکلات
فِی الْمُعْضَلَاتِ۔	میں انہیں حکم بناتے۔ [4]

مالک بن اوس الحدثان البصری کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں "عریف" یعنی اپنی قوم کا سردار تھا [5]

امام ابن تیمیہؒ حضرت عمرؓ کی سیاست کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

فَاِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ	جن معاملات میں اللہ اور اسکے
کَانَ کَثِیْرَ الْمُشَاوَرَۃِ فِیْمَا	رسول کا حکم واضح نہیں ہوتا ان میں
لَمْ یَتَبَیَّنْ فِیْہِ اَمْرُ اللّٰہِ	حضرت عمرؓ بہت زیادہ مشورہ

---

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۶۳، [2] البدایہ والنہایہ ج ۷ صفحہ ۱۰۷، [3] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۴،

[4] الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ ج ۱ ص ۱۹، [5] کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۲،

وَرَسُوْلِهٖ ۔ [1] کرتے تھے ۔

مصر کے جدید مؤرخ محمد حسین ہیکل اور واضح الفاظ میں تصریح کرتے ہیں :

فَجَعَلَ الشُّوْرٰی اَسَاسَ حُکْمِہٖ ۔ [2]
حضرت عمرؓ نے اپنی سیاست کی بُنیاد شورٰی پر قائم کی تھی ۔

امام شعبیؒ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے :

"جس شخص کو مسائل میں قولِ محکم کی خواہش ہو اسے حضرت عمرؓ کے فیصلوں کو اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ آپ صحابہؓ کے مشورہ سے فیصلہ فرماتے تھے ۔" [3]

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی اجتماعی پالیسی کو ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس دَور میں اسلامی رُوح پوری طرح جلوہ گر تھی اور اس کی تابانیوں سے سارا عالم جگمگا رہا تھا ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ ۔
میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی اقتدا کرو ۔ (مسند احمد)

سیّد امیر علی پورے دَورِ خلفائے راشدین پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں :

"خلیفہ ملکی معاملات کو مدینہ کے سربراہِ کار، اکابر صحابہ اور رؤسا قبائل کی مجلس میں پیش کرتا جو کہ مسجدِ نبویؐ میں منعقد ہوتی تھی خلیفہ اس مجلس سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا تھا ۔ اسلام کا ابتدائی تیس سالہ نظامِ حکومت آج کل کے جمہوری نظام سے قریب تر تھا ۔" [4]

خلفائے راشدین کے بعد اسلامی سلطنت آمریت کا قالب اختیار کر چکی تھی لیکن نصف صدی بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نظمِ مملکت کو جاہلیت کی آلائشوں سے نکھار کر اسلامی نقاط پر استوار کیا تھا، اس مجدّدِ خلافت کے متعلق مغیرہؒ کہتے ہیں :

---

[1] منہاج السنۃ ج ۳ صـ ۱۶۳، ۱۶۲ [2] الفاروق ج ۲ صـ ۲۰۸

[3] السنن الکبرٰی ج ۱۰ صـ ۱۰۹ [4] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ صـ ۵۷ تالیف ڈاکٹر محمد حسن

كَانَ يُعَمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ سُمَّارٌ يَسْتَشِيْرُهُمْ فِيْ مَا يُرْفَعُ إِلَيْهِ مِنْ أُمُوْرِ النَّاسِ[1]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے کچھ مشیر تھے جن سے آپ لوگوں کے پیش کردہ معاملات میں مشورہ کرتے۔

ان واضح تصریحات و بیانات کے بعد، آیئے تاریخ کے اوراق میں ان کی شہادتیں تلاش کی جائیں اور واقعات کی دنیا میں ان کا وزن دریافت کیا جائے۔

انتخابِ امیر:

ان واقعات میں صدرِ مملکت کے انتخاب کو اساسی اہمیت حاصل ہے کیونکہ صدرِ مملکت کا انتخاب کسی نظام کی پالیسی کا صحیح صحیح پتہ دیتا ہے اور اس کی مدد سے اس امر کا سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں آمریت کی کارفرمائی ہے یا عوام کی آزادی اور حریت فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اگر کسی نظام میں صدرِ مملکت عوام اور ان کے نمائندوں کے ذریعہ اپنے منصب پر پہنچتا ہے تو یہ جمہوریت اور عوام کی آزادی کی تابناک دلیل ہے اور اس امر کی ضمانت ہے کہ اصل طاقت جمہور کے ہاتھ میں ہے، وہ جب کسی کو اپنا خیرخواہ اور اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کی صلاحیت رکھنے والا پائیں گے تو اپنا امیر اور حاکم منتخب کریں گے اور جس دن انہیں اس امر کا یقین ہو جائے گا کہ ہمارا حاکم ہمارے اغراض و مقاصد کی تکمیل سے قاصر ہے تو وہ اپنے عطا کردہ اختیارات اس سے سلب کر لیں گے۔

لیکن اگر کوئی نظام اپنے امراء و احکام کو عوام کی رضا و عدم رضا سے بے نیاز ہو کر، اقتدار کی کرسی پر بٹھا دیتا ہے اور کسی خاص شخص کی مرضی قانون کی حیثیت رکھتی ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہاں سے جمہوریت کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔

علامہ ابنِ خلدون صدرِ مملکت کے انتخاب کے سلسلہ میں اہلِ سنت والجماعت کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں:

"خلیفہ کا انتخاب صحابہ کے اجماع سے ثابت ہے اور اس کا اختیار قوم کے اہلِ حل و عقد کو ہے، اگر اہلِ حل و عقد کسی کو امیر منتخب کریں تو جمہورِ امت پر اس کی

---

[1] السنن الکبریٰ ج ۱۰ صـ ۱۱۱

اطاعت لازم ہو جاتی ہے۔"[1]

اہلِ حل وعقد کے کرنے کا کیا کام ہے؟ اور وہ کیسے شخص کو خلیفہ مقرر کریں گے؟ اس کی تصریح علامہ ماوردی نے اس طرح کی ہے جو اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہے لیکن دوبارہ اس پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

فَإِذَا اجْتَمَعَ أَهْلُ الْعَقْدِ وَالْحَلِّ لِلْاِخْتِيَارِ تَفَصَّحُوْا أَحْوَالَ أَهْلِ الْإِمَامَةِ الْمَوْجُوْدَةِ فِيْهِمْ شُرُوْطُهَا فَقَدَّمُوْا لِلْبَيْعَةِ مِنْهُمْ أَكْثَرَهُمْ فَضْلًا وَأَكْمَلَهُمْ شُرُوْطًا وَمَنْ يُسْرِعُ النَّاسُ إِلَى طَاعَتِهٖ وَلَا يَتَوَقَّفُوْنَ عَنْ بَيْعَتِهٖ فَإِذَا تَعَيَّنَ لَهُمْ مِنْ بَيْنِ الْجَمَاعَةِ مَنْ أَدَّاهُمُ الْاِجْتِهَادُ إِلَى الْاِخْتِيَارِ عَرَضُوْهَا عَلَيْهِ فَإِنْ أَجَابَ إِلَيْهَا بَايَعُوْهُ عَلَيْهَا وَانْعَقَدَتْ بَيْعَتُهُمْ لَهٗ فَلَزِمَ كَافَّةَ الْأُمَّةِ الدُّخُوْلُ فِيْ بَيْعَتِهٖ وَالْاِنْقِيَادُ بِطَاعَتِهٖ۔[2]

جب اہلِ حل وعقد امیر کے انتخاب کے لیے جمع ہوں گے تو ان اشخاص کے حالات پر غور کریں گے جن میں امامت کی شرطیں پائی جاتی ہیں اور وہ بیعت کے لیے اس شخص کو آگے بڑھائیں گے جو ان میں سب افضل ہو اور جس میں امامت کی شرائط بدرجۂ اُتم پائی جاتی ہوں اور یہ کہ لوگ کس کی طرف تیز گامی دکھائیں گے اور اس کی بیعت کے لیے پس و پیش نہیں کریں گے۔ اور جب ان کی تحقیق و اجتہاد ان میں سے کسی ایک کو چن لے تو منصبِ امامت اس شخص کے سامنے پیش کریں گے اور وہ اسے قبول کر لے تو وہ سب اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور ان کی بیعت اس شخص کے لیے منعقد ہو جائے گی اور ساری اُمت کو اس بیعت میں داخل ہونا اور اس کی اطاعت قبول کرنا لازم ہو جائیگا۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صہ ۱۶۷، فصل فی اختلاف الامۃ فی حکم ہذا المنصب۔ شیعہ کے نزدیک خلیفہ کا تقرر صحابہ کے اجماع سے نہیں بلکہ نص سے ثابت ہے۔

[2] الاحکام السلطانیہ صہ ۵

اسی روشنی میں ہم خلفائے راشدین کے انتخاب کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

خلفائے راشدین کے انتخاب کے سلسلے میں اتنی بات تو اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی انتخاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا[1] اور نہ اس انتخاب میں قرابتِ رسول اور خاندانی تعلق کو کوئی دخل تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد انصارِ مدینہ کو اپنی دینی خدمات اور قربانیوں کے تحت خیال ہوا کہ ہم ہی میں سے خلیفہ ہونا چاہیئے اور یہ خیال بالکل فطری تھا اس لیے کہ کسی زندہ تحریک کی وہی لوگ قیادت کرتے ہیں جو اپنی فداکاریوں اور جاں نثاریوں سے تحریک کے ماننے والوں میں کسی بلند مقام کے مالک ہوتے ہیں۔

اس وقت قدرتی طور پر انصار کی نگاہیں اپنے سردار سعد بن عبادہؓ کی طرف اُٹھیں اور وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کے لیے آمادہ ہو گئے، دریں اثنا اس کی اطلاع مہاجرین کے نمائندوں کو ملی جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ نمایاں مقام رکھتے ہیں فوراً یہ اکابرِ اُمّت سقیفہ بنی ساعدہ (جہاں انصار سعد بن عبادہؓ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے مجتمع تھے) پہنچے اور انہوں نے ملک کے سیاسی حالات کو انصار کے رُوبرُو واضح کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر انصار سے خطاب کر کے جو تقریر کی اس کے چند جملے یہ ہیں:

مَا ذَكَرْتُمْ فِيكُمْ مِنْ خَيْرٍ فَأَنْتُمْ لَهُ أَهْلٌ وَ لَنْ يُعْرَفَ هٰذَا الْأَمْرُ إِلَّا لِهٰذَا الْحَيِّ مِنْ قُرَيْشٍ۔[2]

جو کچھ تم نے اپنی خیر و خوبی کا ذکر کیا یقیناً تم لوگ اس کے مستحق ہو لیکن اہلِ عرب سوائے قریش کی قیادت کے کسی اور کی قیادت سے واقف نہیں ہیں اسلیئے وہ کسی دوسرے قبیلہ کی سرداری پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کا نام پیش کیا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرض النبیؐ ووفاتہ

[2] صحیح بخاری باب رجم الحبلی من الزنی اذا احصنت،

حضرت ابوبکرؓ کی اس تقریر سے انصار کے زیرک اصحاب کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ حضرت ابوبکرؓ کی ہمنوائی کرنے لگے۔ چنانچہ اس گروہ کے مشہور صحابی حضرت زید بن ثابتؓ نے خطاب کیا:

"کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین میں سے تھے، لہٰذا مہاجرین کی قیادت سے عرب مطمئن ہو سکتے ہیں اس لیے خلیفہ کسی مہاجر ہی کو ہونا چاہیے جس طرح آج سے پہلے ہم آنحضرتؐ کے مددگار و معاون رہے اسی طرح خلیفۂ رسول کے بھی دست و بازو بنے رہیں گے۔"[1]

اسی موقع پر حضرت عمرؓ نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت اور آپ کے دینی شرف و مزیت کا تذکرہ کیا اور کہا:

"یہ وہ شخص ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جیسی اہم چیز کی امامت کے لیے آگے بڑھایا تھا، پس کیا جس شخص کو نبیؐ نے مقدم کیا تھا اس سے بھی پیش قدمی کی تم میں سے کسی کو خواہش ہے؟"[2]

یہ سن کر انصار بیک آواز بول اٹھے۔ ابوبکرؓ سے آگے بڑھنے سے ہم پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد انصار و مہاجرین کے جتنے نمائندے وہاں موجود تھے آگے بڑھ کر سب کے سب حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ دوسرے دن حضرت ابوبکرؓ مسجد نبویؐ میں تشریف لے آئے اور حضرت عمرؓ نے مجمع عام میں آپ کی دینی خدمات کا ذکر جمیل کیا جس کے بعد بقیہ تمام مہاجرین و انصار نے بھی بیعت کی، اس طرح بیعتِ عمومی تکمیل پائی۔[3]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس خیال سے کہ خلیفہ کے انتخاب میں ان سے مشورہ نہیں کیا گیا کئی ماہ تک بیعت نہیں کی تھی لیکن اس کے خلاف بھی بہت سی روایات ملتی ہیں جو حقیقتِ حال سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں۔ چنانچہ حاکمؒ، ابنِ سعدؒ اور بیہقیؒ نے بیان کیا ہے کہ بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جس وقت خطبہ دیا تو دیکھا کہ حضرت زبیرؓ اور حضرت علیؓ نظر نہیں آ رہے ہیں، آپ نے دونوں بزرگوں کو بلوایا اور کہا کہ آپ لوگ رسولِ خداؐ کے رشتہ دار

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۷۶ تاریخ الخلفاء، ص ۴۷ بحوالہ ابنِ سعد، بیہقی [2] مسند احمد حدیث نمبر ۱۳۳، تاریخ الخلفاء، ص ۴۶ بحوالہ نسائی، ابویعلیٰ، حاکم۔ [3] صحیح بخاری کتاب الاحکام باب الاستخلاف۔

ہیں، کیا آپ حضرات کی یہ خواہش ہے کہ اُمّت میں افتراق و انتشار پیدا ہو؟ ایسا نہیں ہے تو تم لوگوں نے بیعت کیوں نہیں کی؟ یہ سُن کر دونوں حضرات نے پیش قدمی کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی[1]، یہی نہیں بلکہ متعدد روایات اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت ابوسفیانؓ اور دوسرے بعض لوگوں نے حضرت علیؓ کو بیعت سے باز رکھنے کی سعی کی تھی لیکن حضرت علیؓ نے ابوسفیان کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ اس قسم کی باتیں اُمّت کے افتراق کا ذریعہ بن سکتی ہیں[2]۔ ابن سعدؒ نے حضرت علیؓ کا اس سے واضح بیان نقل کیا ہے۔ قَالَ عَلِیٌّ لَمَّا قُبِضَ النَّبِیُّ نَظَرْنَا فِیْ اَمْرِنَا فَوَجَدْنَا النَّبِیَّ قَدْ قَدَّمَ اَبَا بَکْرٍ فِی الصَّلٰوۃِ فَرَضِیْنَا لِدُنْیَانَا مَنْ رَضِیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ لِدِیْنِنَا فَقَدَّمْنَا اَبَابَکْرٍ۔[3]

عمرو بن حریث نے حضرت سعید بن زیدؓ سے دریافت کیا کہ "کسی نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے انحراف کیا تھا؟" حضرت سعیدؓ نے جواب دیا "کسی نے انحراف نہیں کیا۔ ہاں وہ لوگ الگ رہے جو مرتد ہو گئے تھے یا مرتد ہونے کے قریب تھے۔" عمرو بن حریث نے دوبارہ دریافت کیا کہ "کیا مہاجرین میں سے کسی نے بیعت سے انکار کیا تھا"، جواب دیا۔ "نہیں بلکہ مہاجرین تو بلائے بغیر مسلسل ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے تھے"۔[4]

تاریخ میں صرف سعد بن عبادہؓ کا ایک ایسا نام ملتا ہے جنہوں نے اپنی وفات تک کسی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، حتٰی کہ عام مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں نماز تک نہیں پڑھتے تھے، نظمِ جماعت کی پابندی پر طاقت کے ذریعہ انہیں مجبور کرنا خلافِ مصلحت تھا اس لیے انہیں ان کے حال پر رہنے دیا گیا۔[5]

بعض روایات سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ سعد بن عبادہؓ حضرت ابوبکرؓ کے دلائل سے مطمئن ہو چکے تھے انہوں نے مہاجرین کے استحقاقِ خلافت کو تسلیم بھی کر لیا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے دلائل کو مانتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] تاریخ الخلفاء صـ ۴۷ [2] منہاج السنۃ ج ۱ صـ ۱۳ [3] طبقات ابنِ سعد ج ۳ صـ ۱۳

[4] تاریخ طبری ج ۳ صـ ۳۶ [5] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ صـ ۱۰

صَدَقْتَ فَنَحْنُ الْوُزَرَاءُ وَ اَنْتُمُ الْاُمَرَاءُ۔ [1]

آپ نے سچ کہا ہم وزراء ہیں اور آپ لوگ امراء۔

امام ابن تیمیہؒ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے متعلق فرماتے ہیں:

وَلَا قَالَ اَحَدٌ مِنَ الصَّحَابَةِ اَنَّ غَيْرَ اَبِي بَكْرٍ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ اَحَقُّ بِالْخِلَافَةِ مِنْهُ وَلَمْ يُنَازِعْ اَحَدٌ فِي خِلَافَتِهِ اِلَّا بَعْضَ الْاَنْصَارِ طَمَعًا اَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْاَنْصَارِ اَمِيْرٌ وَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ اَمِيْرٌ ...... ثُمَّ الْاَنْصَارُ جَمِيْعُهُمْ بَايَعُوْا اَبَا بَكْرٍ اِلَّا سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ لِكَوْنِهِ هُوَ الَّذِي كَانَ يَطْلُبُ الْوِلَايَةَ وَلَمْ يَقُلْ قَطُّ اَحَدٌ مِنَ الصَّحَابَةِ اَنَّ فِي قُرَيْشٍ مَنْ هُوَ اَحَقُّ بِهَا مِنْ اَبِي بَكْرٍ لَا مِنْ بَنِي هَاشِمٍ وَلَا مِنْ غَيْرِ بَنِي هَاشِمٍ وَهٰذَا كُلُّهُ مِمَّا يَعْلَمُهُ الْعُلَمَاءُ الْعَامِلُوْنَ بِالْاٰثَارِ وَالسُّنَنِ وَالْحَدِيْثِ۔ [2]

صحابہؓ میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ مہاجرین میں حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ اور کوئی مستحق خلافت ہے اور آپ کے خلیفہ بنائے جانے میں بعض انصار نے اس وجہ سے مخالفت کی کہ ان میں سے ایک امیر اور مہاجرین میں سے ایک امیر ہو ...... پھر سوائے سعد بن عبادہؓ کے تمام انصار نے آپ سے بیعت کی، چونکہ سعد خود بیعت کے طالب تھے اس وجہ سے وہ بیعت پر رضامند نہیں ہوئے، کسی صحابی نے یہ نہیں کہا کہ قریش میں کوئی حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ خلافت کا مستحق ہے نہ بنی ہاشم نے یہ دعویٰ کیا اور نہ غیر بنی ہاشم نے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں آثار و سنن کے تمام باعمل واقف کار بخوبی جانتے ہیں۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۹۹، مسند احمد حدیث نمبر ۱۸۔ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ اس کے آخری راوی حمید بن عبدالرحمٰن ہیں جو کہ بالاتفاق تابعی ہیں۔

[2] منہاج السنۃ ج ۱ ص ۱۳۹۔

حضرت عمرؓ کی بیعت :

حضرت عمرؓ کی بیعت کے سلسلہ میں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ غیر جمہوری طریقہ سے انجام پائی تھی گویا خلیفۂ وقت نے اپنی دانست میں کسی کو بہتر سمجھا اور اسے عوام کا خلیفہ مقرّر کر دیا حالانکہ یہ واقعہ کی بالکل غلط اور تاریخی حقائق سے ہٹی ہوئی تعبیر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اُمّت کے امیر اور حاکم تھے۔ ان کا یہ فرضِ منصبی تھا کہ امت کی اصلاح و فلاح پر غور کرتے انھوں نے اُمّت کے حق میں یہ بہتر سمجھا کہ اپنی زندگی ہی میں کسی افضل اور صلح ترین شخص کو اپنا جانشین مقرّر کر دیا جائے تاکہ اُمّت ان کے انتخاب کے سے اختلافات سے دوچار نہ ہو لیکن یہ کام حضرت ابو بکرؓ محض اپنی مرضی سے انجام نہیں دے سکتے تھے ؛ اس کے لیے اُمّت کے نمائندوں کا اتفاق ناگزیر تھا، چنانچہ آپ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ سے امّت کے ایک اہل ترین شخص حضرت عمرؓ کے بارے میں رائے لی۔ عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ وہ آپ کی رائے سے بھی بہت بلند ہیں لیکن ان میں کسی قدر سختی ہے، حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ صورتِ حال یہ نہیں ہے چونکہ وہ مجھ میں نرمی دیکھتے ہیں اس لیے وہ سختی کرتے ہیں تاکہ عملِ جراحی اور مرہم پٹی کا حسین امتزاج قائم رہے اور امّت صلاح کی طرف گامزن ہو، اس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ بسا اوقات جب انہوں نے میرے رویّہ میں سختی دیکھی تو خود موم بن گئے اور نرم پالیسی کا مشورہ دیا۔

اس کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ سے بھی مشورہ کیا۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب کی پوری پوری تائید کی[1] حضرت ابو بکرؓ نے ان دونوں بزرگوں کے علاوہ سعید بن زیدؓ، اسید بن حضیرؓ اور دیگر مہاجرین و انصار سے بھی مشورہ کیا۔[2]

بعض لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب کو ناپسند کرتے ہوئے کہا کہ عمرؓ جیسے سخت گیر انسان کو اپنا جانشین مقرر کر کے اللہ کو آپ کیا جواب دیں گے ؟ حضرت ابو بکرؓ نے ان کی غلط رائے کی ایک لطیف پیرایۂ بیان میں تردید کی، فرمایا میں اللہ کو یہ جواب دوں گا

---

[1] تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۷۸ ، [2] طبقات ابن سعد القسم الاوّل ج ۳ ص ۱۴۱

کہ میں نے اُمت کے افضل شخص کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔

علامہ ابن قیمؒ کی باریک بیں نگاہ اس معاملہ میں ایک اور باریکی تلاش کر لیتی ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی جانشینی میں حضرت ابوبکرؓ کا صحیح قیاس کارفرما رہا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے سوچا کہ ان کا اپنا انتخاب اُمت کے ارباب حل وعقد میں شامل ہونے کی وجہ سے ہوا تھا اور عمرؓ بھی اسی طبقہ میں شامل ہیں لہٰذا اگر انہیں جانشین مقرر کیا جائے تو اُمت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا[1]

لیکن ان تمام پہلوؤں کے ہوتے ہوئے بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے کو عوام پر قوت و اقتدار کے ذریعہ مسلط نہیں کیا بلکہ عوام کی تائید ہی کے بعد اسے آخری اور قطعی شکل دی، آپ نے مرض الموت میں صحابہ کے ایک مجمع سے خطاب کر کے فرمایا۔

أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ حَضَرَنِي مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ مَا تَرَوْنَ وَإِنَّهُ لَا بُدَّ لَكُمْ مِّنْ رَجُلٍ يَلِي أُمُوْرَكُمْ وَيُصَلِّي بِكُمْ وَيُقَاتِلُ عَدُوَّكُمْ فَيَأْمُرُكُمْ فَإِنْ شِئْتُمْ اجْتَمَعْتُمْ فَأْتَمَرْتُمْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ عَلَيْكُمْ مَنْ أَرَدْتُمْ وَإِنْ شِئْتُمْ اجْتَهَدْتُ لَكُمْ رَأْيِي وَوَالَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَا آلُوْكُمْ فِي نَفْسِي خَيْرًا۔

لوگو، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو مجھ تک اللہ کا فیصلہ آپہنچا ہے۔ میرے بعد تم لوگوں کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو تمھارے کاموں کا سرپرست اور نگران ہو اور نماز میں تمھاری امامت کرے اور تمھارے دشمن کا مقابلہ کرے اور تم پر حکومت کرے اگر تم چاہو تو آپس میں مشورہ سے جسے چاہو خلیفہ منتخب کر سکتے ہو اور اگر تمھاری خواہش ہو تو میں کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کی کوشش کروں، بخدا میں اس سعی و جہد میں کسی قسم کی

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۸۷

کوتاہی نہیں کروں گا۔

اس کے بعد خوف قیامت سے حضرت ابوبکرؓ کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور آپ کے ساتھ سارا مجمع رو پڑا اور سب نے بیک آواز کہا۔

اَنْتَ خَیْرُنَا وَ اَعْلَمُنَا فَاخْتَرْ لَنَا قَالَ سَاَجْتَہِدُ رَأْیِیْ وَ اَخْتَارُ لَکُمْ خَیْرَکُمْ اِنْشَاءَ اللّٰہُ۔ [1]

آپ ہم میں کے بہتر اور ہم سے زیادہ واقف کار ہیں لہٰذا آپ اپنی صوابدید کے مطابق خلیفہ منتخب کیجئے یہ سُن کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا اچھا تو میں اس سلسلہ میں غور کروں گا اور تم میں سے بہتر شخص کو تمہارا خلیفہ مقرر کروں گا۔

ان تصریحات کی موجودگی میں اور نمائندگانِ اُمّت کو مطمئن کر چکنے کے بعد کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ انتخاب عوام کی مرضی سے رو بعمل نہیں آیا؟ اگر عوام کی مرضی مطلوب نہ ہوتی تو ابوبکرؓ کبھی یہ نہ کہتے کہ "اگر چاہو تو تم خود اپنا حاکم مقرر کر لو۔"

حضرت عمرؓ کے تقرر پر صرف ایک اعتراض ہو سکتا تھا اور وہ تھا ان کی سختی، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیان سے اس کی تردید کر دی اور خود حضرت عمرؓ کی بھی اپنے بارے میں بالکل یہی رائے تھی ایک موقع پر فرماتے ہیں "کہ دَورِ رسالت میں مجھ میں جو شدت تم لوگ محسوس کرتے تھے اس کی وجہ آنحضرتؐ کی لینت تھی۔" [2]

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تقرر کی کسی نے بھی مخالفت نہیں کی ایک وقت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "آپ کی خلافت کے بارے میں دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہیں کیا۔" [3]

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ صـ ۱۹ [2] مستدرک حاکم ج ۱ صـ ۱۳۶

[3] کتاب الخراج ـ صـ ۸-۷

حضرت عثمانؓ کی بیعت:

خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کا انتخاب شورائیت کا مظہرِ اتم تھا، جیسے کہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس دَور میں بارِ خلافت صرف مہاجرین قریش ہی برداشت کر سکتے تھے کسی دوسرے شخص پر اُمّت کا اجماع دشوار تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب تک اہلِ بدر میں کا ایک فرد بھی باقی ہے تو خلافت ان ہی میں رہے گی پھر اصحابِ احد اس کے مستحق ہوں گے جب تک ان میں کا ایک شخص بھی زندہ ہے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں مل سکتا اس کے بعد حسبِ مراتب لوگ اس ذمّہ داری کے اہل قرار پائیں گے۔ فتح کے بعد ایمان لانے والوں کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا[1] یعنی قوم خلافت کے سلسلہ میں لوگوں کی قربانیوں اور اسلام سے ان کے دیرینہ تعلّق کو دیکھے گی، بلا استحقاق پیدا کیے کوئی شخص اس عظیم منصب کا اہل نہیں قرار پا سکتا۔

حضرت عمرؓ سے ان کے آخری لمحاتِ حیات میں صحابۂ کرامؓ نے مطالبہ کیا کہ آپ اپنا جانشین مقرر کر جائیے[2] اور خود حضرت عمرؓ کی نگاہ میں حضرت علیؓ کی شخصیت اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے اس عظیم ذمّہ داری کی مستحق تھی اور ان کا تقرر اُمّت کے حق میں آپ بہتر سمجھتے تھے[3] کیونکہ حضرت علیؓ سابقین میں سے تھے، اصحابِ بدر میں تھے اور ساتھ ہی ساتھ آسمانِ علم و فضل کے نیّرِ درخشاں اور خدا ترسی میں ضرب المثل تھے؛ آپ کے فرزند حضرت عبداللہؓ نے بھی حضرت علیؓ کی جانشینی کا مشورہ دیا تھا[4] لیکن اس مطالبہ اور اہلِ تر شخص کے ہوتے ہوئے بھی آپ نے کسی کو خلیفہ بنانے سے انکار کر دیا اور عبداللہ بن عباسؓ سے ایک مرتبہ فرمایا۔ میری طرف سے تین باتیں محفوظ کر لو جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ نہیں بنایا ہے[5] اس کے بجائے آپ نے یہ کام علیؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ پر مشتمل ایک کمیٹی کے حوالے کر دیا کہ وہ غور و فکر کے بعد اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں[6] یہ اُمّت کے چیدہ افراد تھے جن کا حسنِ سیرت

---

[1] طبقات ابنِ سعد القسم الاوّل ج ۳ ص ۲۴۸ [2] صحیح بخاری کتاب الاحکام باب الاستخلاف

[3] تاریخ طبری، تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۸ [4] استیعاب لابن عبدالبر تذکرۂ عمرؓ [5] طبقات ابنِ سعد ج ۳ ص ۲۵۶

[6] مشکوٰۃ کتاب المناقب بحوالۂ بخاری۔

اور شرف و کمال مسلّم تھا اور جن کے تقویٰ اور خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ زبانِ رسالت ان کے جنتی ہونے کی اسی دنیا میں بشارت دے چکی تھی[1] اور ان افراد پر اُمت کے اعتماد کا یہ عالم تھا حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

إِنِّي قَدْ نَظَرْتُ لَكُمْ	میں نے تمہارے سلسلہ میں لوگوں کے
فِي أَمْرِ النَّاسِ فَلَمْ	خیالات کا جائزہ لیا پس میں نے لوگوں
أَجِدْ عِنْدَ النَّاسِ شِقَاقًا	کے اندر تمہارے بارے میں کسی قسم
إِلَّا أَنْ يَكُونَ فِيكُمْ	کا اختلاف نہیں پایا الّا یہ کہ اختلاف خود
فَإِنْ كَانَ	تمہارے درمیان پھوٹ پڑے۔ لہٰذا
شِقَاقٌ فَهُوَ	اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو تمہاری ہی
لَكُمْ۔[2]	وجہ سے ہوگا۔

حضرت عمرؓ نے اس کمیٹی کو حکم دیا کہ وہ بعض دیگر اکابرِ اُمت مثلاً عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسنؓ کو بھی شریکِ مشورہ کر لے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تصریح کر دی کہ ان کی حیثیت محض مشیروں کی ہے خلافت کا بار مذکورہ بالا چھ افراد ہی میں سے کوئی سنبھالے گا۔[3] کیونکہ خلافت کا ان افراد سے ہٹ جانا اُمت کے انتشار کا سبب بن سکتا ہے۔

مہاجرین پر مشتمل اس کمیٹی کے تعین کے بعد مشہور صحابی حضرت ابو طلحہؓ کو حکم دیا کہ "تم اپنی قوم (انصار) کے پچاس منتخب اشخاص کے ذریعہ اس کمیٹی کو مجبور کر دو کہ وہ تین دن کے اندر اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کرے"[4]

حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد ان چھ افراد کی کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے اور تین دن تک بحث و تمحیص ہوتی رہی اور کوئی بات طے نہیں پائی۔ یہ دیکھ کر عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کمیٹی کے افراد سے دریافت کیا کہ کیا آپ لوگوں میں سے کوئی دوسرے کے لیے اپنے

---

[1] مشکوٰۃ کتاب المناقب بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ

[2] طبقات ابنِ سعد ج ۳ صـ ۲۴۹

[3] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ صـ ۲۵

[4] طبقات ابنِ سعد ج ۳ صـ ۴۲، تاریخ کامل ج ۳ صـ ۲۸

حق خلافت سے دست بردار ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں حضرت زبیرؓ نے فرمایا میں حضرت علیؓ کے حق میں اپنا ووٹ دیتا ہوں اور حضرت طلحہؓ حضرت عثمانؓ کے حق میں اور حضرت سعدؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حق میں اپنے حقوق سے دستبردار ہو گئے[1] اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے خلافت کی کوئی ضرورت نہیں، کیا آپ لوگ مجھے حکم ماننے کے لیے تیار ہیں؟ حضرت علیؓ نے فوراً کہا ہاں میں آپ کو حکم تسلیم کرتا ہوں آپ جو بھی فیصلہ کریں گے میرے لیے قابل قبول ہو گا۔[2] اسی طرح کمیٹی کے دوسرے ارکان نے بھی آپ کو اپنا حکم مان لیا۔[3]

بحث کے یہاں تک پہنچ جانے کے بعد عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ناموں کو قوم کے رُوبرُو پیش کیا تاکہ ان کی مرضی معلوم کی جا سکے۔ مدینہ یوں بھی مہاجرین وانصار کا مرکز تھا، لیکن حضرت عمرؓ کی شہادت کی وجہ سے اور نئے خلیفہ کے انتخاب سے واقف ہونے کے لیے مختلف علاقوں کے گورنر اور بہت سارے شہروں کے سردار اور معزز افراد مدینہ میں جمع ہو گئے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان تمام کا عندیہ معلوم کرنے کی سعی کی، اہل الرائے حضرات سے صلاح و مشورہ کیا اور عام لوگوں سے محض ان کی رائے دریافت کی جس کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثریت حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے، دوسرے دن آپ نے تمام مہاجرین وانصار کو مسجد میں جمع کیا اور تقریر کی کہ "میں نے رائے عامہ دریافت کرنے کی حتی الوسع کوشش کی جس کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اکثریت حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے اور ان کو اپنا امیر تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ لہٰذا میں قلاوۂ خلافت حضرت عثمانؓ کی گردن میں ڈال رہا ہوں"۔ اس اعلان کے سنتے ہی سب سے پہلے پیش قدمی کر کے حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۲۵ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۱۰

[3] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۲۵

کی، پھر دوسرے لوگ بھی مسلسل بیعت کرنے لگے۔[1]

علامہ ابن اثیرؒ کے الفاظ میں "تمام اہلِ شوریٰ نے حضرت عثمانؓ کی بیعت پر اجماع کیا۔"[2] اس سے بھی آگے بڑھ کر حضرت امام احمد بن حنبلؒ جن کی نظر آثار و سنن پر نہایت وسیع رہی ہے تصریح کرتے ہیں کہ "حضرت عثمانؓ کی بیعت پر جس قدر اجماعِ عام ہوا اتنا اجماعِ عام خلفائے راشدین میں سے کسی کی بیعت پر نہیں ہوا۔"[3]

حضرت علیؓ کی بیعت:

حضرت عثمانؓ کے دورِ آخر میں مملکتِ اسلامیہ میں اضمحلال اور انتشار رونما ہو گیا تھا اور اچھا خاصا ایک فاسد عنصر ملک میں ہنگامہ سازی اور فتنہ خیزی کے درپے ہو گیا جس کے نتیجہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا المناک سانحہ پیش آیا، اس حادثۂ عظیم سے ملک کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک افراتفری اور بدنظمی پھیل گئی، اس طوفان کو فرو کرنا اور حالات کو اپنے اصلی محور پر لانا زہرہ گداز کام تھا، ایسے پُرہول اور نازک حالات میں خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔

ہم گزشتہ صفحات میں حضرت علیؓ کی بیعت کی طرف چند اجمالی اشارات کر چکے ہیں جن

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۳، البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۱۴۷۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ان روایات پر سخت تنقید کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان سنتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ غضب ناک ہو گئے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے کہا کہ تم نے محض قرابت داری کا خیال کر کے اور اس امید پر کہ عثمانؓ کے بعد خود خلیفہ بن جاؤ، عثمانؓ کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ چنانچہ یہ کہہ کر آپ مجمع سے واپس ہونے لگے اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پکار پکار کر کہا "وَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ" اس وعید کو سن کر حضرت علیؓ واپس لوٹے اور بادلِ ناخواستہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔" حافظ موصوفؒ نے لکھا ہے کہ یہ روایات مجہول الحال اشخاص سے مروی ہیں اس لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔

[2] تاریخ کامل ج ۳ ص ۳۳

[3] منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱۶۲۔

سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اربابِ حل وعقد کی اکثریت نے آپ کو حقِ خلافت عطا کیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے جن چھ افراد کو امت کا نمائندہ قرار دیا تھا اُن میں حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اس وقت موجود تھے۔ حضرت علیؓ نے ان سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لوں یا تم میرے ہاتھ پر بیعت کر لو، دونوں نے جواب دیا ہم آپ کو ہی خلافت کا مستحق سمجھتے ہیں [1]

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کے باوجود مہاجرین وانصار نے بیحد اصرار سے آپ کو خلیفہ منتخب کیا[2] ابنِ سعدؒ کے بیان کے مطابق:

جَمِيْعُ مَنْ كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ	مدینہ کے تمام لوگوں نے حضرت علیؓ
مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ	کے ہاتھ پر بیعت کی جن میں اصحابِ
وَغَيْرِهِمْ [3]	رسول اور دیگر اصحاب شامل تھے۔

مہاجرین میں صرف دو ہی چار افراد کے نام ملتے ہیں جنہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا انصار کے متعلق علامہ ابنِ اثیرؒ لکھتے ہیں:

وَبَايَعَتِ الْاَنْصَارُ اِلَّا	ایک بہت ہی مختصر گروہ کے علاوہ تمام
نَفَرًا يَسِيْرًا ۔[4]	انصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

اور ان بیعت نہ کرنے والوں میں بیشتر افراد اسی وجہ سے بیعت کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے کہ اُمت کی مرضی دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر تمام ممالکِ اسلامیہ میں بیعت ہو جائے تو وہ بیعت کرنے کے لیے آمادہ تھے۔

چاروں خلفاء کے انتخاب کی تفصیل کے بعد ہم اس دَور کے اور دو چار واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے اسلام کے نظامِ شورائیت کے سمجھنے میں بہت کچھ

---

[1] تاریخ طبری ج ۵ ص ـــ تاریخ کامل ج ۳ ص ۸۰ [2] طبری ج ۵ ص ۱۵۲
[3] طبقات ابنِ سعد ج ۳ ص ۲۰ [4] تاریخ کامل ج ص ۸۰ ـ

مدد مل سکتی ہے ۔

مانعین زکوٰۃ سے قتال :

حضرت ابوبکرؓ کے دو فیصلوں کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ نے اہلِ شوریٰ کے مشوروں کو نظر انداز کر دیا اور اپنی انفرادی رائے کو اربابِ حل و عقد کی رائے پر ترجیح دی جن میں سے پہلا واقعہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کا ہے ۔ آیئے ہم اس واقعہ کی حقیقت حدیث و تاریخ کی کتابوں میں تلاش کریں ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے چاروں طرف ارتداد کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ، ان مرتد قبائل میں بعض وہ قبیلے تھے جنہوں نے صاف صاف دینِ اسلام کا قلادہ ہی اپنی گردن سے اتار پھینک دیا تھا ، بعض نے زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار کیا اور بعض نے اس کو فرضیت سے تو انکار نہیں کیا البتہ ادائیگی زکوٰۃ سے مکر گئے ۔

ان تینوں ہی طبقات کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے علم جہاد بلند کرنا چاہا ؛ پہلے گروہ کے بارے میں صحابہ کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا لیکن دوسرے اور تیسرے گروہ کے خلاف تلوار اٹھانے میں بعض صحابہ کو پس و پیش تھا جن میں حضرت عمرؓ کی ذاتِ گرامی سب سے آگے تھی ، حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ ایک شخص کلمۂ توحید کا اقرار کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ منکرینِ زکوٰۃ کلمۂ توحید کا تو اقرار کر رہے ہیں اور دعوائے مسلمانی پر قائم ہیں پھر کیسے ان کے خلاف قوت استعمال کی جائے ؟ چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا ۔

كَيْفَ تُقَاتِلُ النَّاسَ	آپ ان لوگوں سے کیسے جہاد کر سکتے
وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ	ہیں ؟ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے
اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ	کہ مجھے لوگوں سے جنگ کا حکم دیا گیا
النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا	ہے ۔ یہاں تک کہ وہ کلمۂ توحید کا
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَمَنْ قَالَهَا	اقرار کریں اگر انہوں نے ایسا کیا تو
فَقَدْ عَصَمَ مِنِّيْ مَالَهٗ	اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا ، اِلَّا

وَنَفْسَہٗ اِلَّا بِحَقِّہٖ وَ حِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ۔ یہ کہ اسلام ہی کا حق ان کی جان و مال کا مطالبہ کرے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

(رواہ الجماعۃ الا ابن ماجہ)

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ مجرد کلمۂ توحید کا اقرار کافی نہیں ہے بلکہ اپنی جان و مال کے تحفّظ کے لیے اس کے دو اہم تقاضوں کی تکمیل بھی ناگزیر ہے جن میں سے ایک نماز ہے، جو خدا تعالیٰ کے عطا کردہ نفسی و جانی عطیوں کا حق ہے اور دوسرا تقاضا زکوٰۃ ہے جو مالی انعامات کا حق ہے، ان دونوں کی اہمیت ایک سی ہے لہٰذا ان دونوں کو کسی صورت سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اسی وجہ سے قرآن پاک نے ہمیشہ ان دونوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے جس طرح نماز کے منکرین کے خلاف جہاد کیا جائے گا اسی طرح زکوٰۃ کے مانعین کے خلاف بھی جہاد کیا جائے گا، دونوں کے درمیان تفریق کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔

ابن قتیبہؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دعوٰوں کے ثبوت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی پیش کی تھی[1] جس میں صاف تصریح کی گئی ہے کہ جان و مال کی ضمانت نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہے۔

ان دلائل کے سامنے آنے کے بعد حضرت عمرؓ بے اختیار بول اٹھے:

”خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کے سینے کو کھول دیا ہے اور اب میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ ہی کی رائے برحق ہے اور فرطِ مسرت سے بے اختیار حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ کو بوسہ دینے لگے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی انفرادی رائے پر عمل نہیں کیا تھا بلکہ دلائل کی قوت سے دوسروں کو اپنی ہمنوائی پر مجبور کیا تھا۔

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ صـ ۱۷

جیشِ اسامہؓ :

دوسرا واقعہ جیشِ اسامہؓ کی روانگی سے متعلق ہے جس کے بارے میں بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اہل الرائے کے مشورہ کو ٹھکرا دیا اور اپنی ذاتی رائے کو نافذ کیا۔ یہ غلط فہمی تاریخ سے ناواقفیت کے باعث پیدا ہوئی ہے۔

② جیشِ اسامہؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دیا تھا لیکن اس لشکر کو اپنی مہم پر بھیجنے سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آگیا اور حضرت ابوبکرؓ کو بارِ خلافت سنبھالنا پڑا۔

ملک کے حالات کے پیشِ نظر صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ اس لشکر کو محاذِ جنگ پر نہ بھیجا جائے اور اس جنگی قوت سے ملک کے داخلی فسادات کو فرو کرنے میں مدد لی جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ ایک ایسے مؤکد کام کی تعمیل سے باز آتے یا کم از کم مؤخر کر دیتے ہیں جس کے سرانجام دینے پر نبیؐ نے مرض الموت میں بھی بار بار زور دیا ہو، چنانچہ جس وقت حضرت عمرؓ نے آپ سے اس مہم کو روکنے کی درخواست کی تو آپ نے جواب دیا:

"اگر سارا عرب اسلام سے منحرف بھی ہو جائے اور ان کے مقابلہ کے لیے سوائے میرے اور کوئی باقی نہ رہے تو بھی میں اس لشکر کو روانہ کرنے سے باز نہیں آسکتا خواہ اس کے نتیجہ میں مجھے پرندے نوچ ہی کر کیوں نہ کھا جائیں۔"

حضرت ابوبکرؓ کی اس پرعزم تقریر سے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے حقیقتِ حال منکشف ہو گئی اور لوگ مطمئن ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے لوگوں کے اس مطالبہ کا تذکرہ کیا کہ فوج کے کمانڈر اسامہؓ بن زیدؓ کو بدل کر کسی دوسرے بلند مرتبہ اور تجربہ کار شخص کو قائد متعین کیا جائے کیونکہ فوج کے معزز حضرات کے لیے ایک نوجوان اور غلام زادہ شخص کی قیادت میں جنگ کرنا کسی قدر توہین اور ذلت کا سبب ہے" لیکن اس کی تعمیل بھی حضرت ابوبکرؓ کے لیے ناممکن تھی کیونکہ اس نوجوان قائد کا انتخاب بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور ابن جریر طبری کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انتخاب پر منافقوں

نے طعن و تشنیع بھی کی تھی[1] لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہؓ ہی کو قائد منتخب کیا اور تنقید کرنے والوں سے خطاب کر کے کہا:

اِنْ تَطْعَنُوْنَ فِيْ	اگر تم اسامہؓ کی امارت پر طعن کرتے
اَمَارَتِهٖ فَقَدْ كُنْتُمْ	ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے تم
تَطْعَنُوْنَ فِيْ اِمَارَةِ	نے اس سے پہلے اس کے باپ کی
اَبِيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ ايْمُ	امارت پر بھی تنقید کی تھی حالانکہ قسم بخدا
اللّٰهِ وَاِنْ كَانَ لَخَلِيْقًا لِلْاِمَارَةِ	اس کا باپ امارت کا اہل تھا اور وہ
وَاِنْ كَانَ لَمِنْ اَحَبِّ	مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور
النَّاسِ اِلَيَّ وَاِنَّ هٰذَا اَمِنْ	اس کے بعد اس کا بیٹا مجھے سب سے
اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ بَعْدَهٗ[2]	زیادہ محبوب ہے۔

خاندانی شرف کو اہلیت وعدم اہلیت کا معیار قرار دینا اور نبیؐ کے طے کردہ فیصلہ پر طعن و تشنیع کرنا سوائے منافقین کے اور کس کا کردار ہو سکتا ہے؟ اس ذہنیت کا استیصال اسلام کے اہم مقاصد میں سے ہے، اسلام کے نزدیک کسی معروف خاندان سے تعلق رکھنا، کسی متموّل باپ کا لڑکا ہو جانا وجہ شرف نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک تفوق و برتری انسان کی ذاتی صلاحیت اور اس کے حسنِ عمل پر ہے۔ منافقین کی تنقید اسلام کے اس اصول سے متناقض تھی نہ نبیؐ اس ذہنیت کے رُوبرُو سرِ خم کر سکتا تھا نہ اس کا کوئی سچّا جانشین، اگر اس ذہنیت کی پرچھائیں بھی کہیں نظر آ رہی تھیں تو جانشینِ نبی کا یہ فرض تھا کہ وہ اس کی اصلاح کرتا۔ چنانچہ جس وقت بعض صحابہ کے دل و دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ فوج اسامہؓ کی قیادت پر شاید مطمئن نہ ہو، اس لیے اسامہؓ کی جگہ اکابر صحابہ میں سے کسی اور کو منتخب کیا جائے اور انہوں نے حضرت عمرؓ کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ تک یہ بات پہنچائی تو صدیقِ اکبر طیش میں آ گئے اور فاروق اعظمؓ سے کہا:

ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ وَعَدِمَتْكَ	اے ابنِ خطاب تیری ماں تجھے گم کر دے

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۸۹ ، [2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب بعث النبیؐ اسامۃ بن زید فی مرضہ۔

یَا ابْنَ الْخَطَّابِ اسْتَعْمَلَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتَأْمُرُنِیْ اَنْ اَنْزِعَهٗ۔ [1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قائد مقرر کیا ہے اور تو مجھے اسے برطرف کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ صدیق اکبرؓ کے سامنے ایک طرف عوام کے مطالبات تھے اور دوسری طرف اسلام کے اصول اور اللہ کے رسولؐ کی ہدایات تھیں، حضرت ابوبکرؓ کے لیے دوسرا پہلو اختیار کیے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ جب حقیقتِ حال واضح ہو گئی تو مومنین، صادقین نے حضرت ابوبکرؓ کی نہ صرف موافقت کی بلکہ دل و جان سے آپ کا ساتھ دیا۔

ارضِ سواد کی تقسیم :

اسلامی قانون کے مطابق جو اشیا، اسلامی فوج کے قبضہ میں آجائیں انہیں سپاہیوں کے درمیان تقسیم کر دینا چاہیئے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عراق فتح ہوا اور آپ نے مالِ غنیمت اسلامی فوج کے درمیان تقسیم کر دیا لیکن زمین کے متعلق یہ رائے دی کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے بلکہ ملکی ضروریات کی تکمیل کے لیے ریاست کے قبضہ میں رکھا جائے، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی آپ کی رائے کی تائید کی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے اس رائے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ زمین اور مال دونوں کی ایک ہی حیثیت ہے۔ جب مال تقسیم کر دیا گیا تو زمین کی تقسیم کے بارے میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ امام زہریؒ کے قول کے مطابق عام لوگ شروع میں ان ہی بزرگوں کے ہم خیال تھے۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ قرآن کے بیان کے مطابق بعد میں آنے والی نسلوں کو بھی اس مال سے حصہ ملنا چاہیئے اگر یہ مال آج فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تو ان کی اولاد اس کی وارث ہو جائے گی اور عام لوگ اس سے متمتع نہیں ہو سکتے، علاوہ ازیں آئے دن ریاست کو بہت ساری ایسی ضروریات پیش آتی رہتی ہیں جن کی تکمیل مال کے بغیر ناممکن ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عمرؓ کے اس استدلال کو تسلیم نہیں کیا اور کہا

---

[1] الصدیق تالیف محمد حسین ہیکل ص ۱۰۳ ، [2] یہ تفصیل امام ابویوسفؒ کی کتاب الخراج کے مختلف مقامات سے لی گئی ہے۔

کہ مستقبل کے موہوم خطرات کو سامنے رکھ کر ان جانبازوں کو محروم کرنا صحیح نہ ہوگا جنہوں نے اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر عراق فتح کیا ہے۔

بہرحال حضرت عمرؓ کی شوریٰ میں کئی دن تک یہ بحث جاری رہی اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ جس کے بعد حضرت عمرؓ نے مہاجرین وانصار کے نمائندوں کو طلب کیا اور ان کے رُوبرُو ایک جامع و مانع تقریر کی جس میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ کی رائے پیش کی اور اپنی رائے کو بھی دلائل و براہین کے ساتھ نمائندوں کے سامنے رکھ دیا۔ اور کہا کہ اگر ملک کے لیے مستقل آمدنی کے ذرائع مسدود ہو جائیں تو ملک مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اس لیے ضروری ہے کہ مقبوضہ زمین مملکت کے قبضہ میں رہے اور اس کے قدیم باشندوں ہی کو بٹائی پر کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ حضرت عمرؓ کے دلائل سے قوم کے نمائندے مطمئن ہو گئے اور آپ کی رائے کی توثیق کی۔

اسی نمائندہ مجلس میں آپ نے یہ مسئلہ بھی اٹھایا کہ کس شخص کو ان مقبوضہ زمینات کا نگراں مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے حضرت عثمان بن حنیفؓ کا مشورہ دیا اور وہ نگراں مقرر کیے گئے۔

انسدادِ فتنہ کے لیے شوریٰ :

حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں ملک کے چاروں طرف فتنہ و فساد کی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں اور تمام علاقوں سے بدامنی اور انتشار کی مسلسل اطلاعات مرکزِ خلافت کو پہنچ رہی تھیں ان نازک حالات میں بھی خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ نے جمہوریت کی رُوح کو کوئی صدمہ پہنچنے نہیں دیا، حالات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے آپ نے اہلِ مدینہ کو مدعو کیا اور مرکزِ خلافت کو پہنچنے والی اطلاعات کے اسباب و علل کی تحقیق کی، اس وقت حضرت عثمانؓ اہلِ مدینہ سے فرماتے ہیں: "اَنْتُمْ شُرَکَائِیْ وَشُھُوْدُ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاَشِیْرُوْا عَلَیَّ" یعنی تم چونکہ مومنین کے نمائندے اور ان کے سردار ہو اس لیے میرے شریکِ کار ہو اور خلافت کی ذمہ داری میں ہم سب شریک ہیں، لہٰذا ہم سب کو مل جل کر اس معاملہ کے صحیح اسباب کی چھان بین کرنی چاہیے پس تم اپنے مشوروں سے میرے اس کام میں مدد کرو تاکہ میں کوئی اقدام کر سکوں۔

اہلِ مدینہ نے جب آپ کو مشورہ دیا کہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے مرکزِ خلافت سے بعض

باصلاحیت افراد کو مختلف علاقوں میں بھیجنے کی ضرورت ہے تو آپ نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اور مختلف افراد کو مختلف علاقوں کی طرف روانہ کیا۔

ایک مصری عالم صادق ابراہیم عرجون لکھتے ہیں:

وَقَدْ جَعَلَ مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ۔ وَهُمْ سَادَةُ الْأُمَّةِ وَأَعْلَامُهَا وَفِيْهِمْ أَعْضَاءُ مَجْلِسِ شُوْرٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ الْمُرَشَّحُوْنَ لِلْخِلَافَةِ مَجْلِسًا نِيَابِيًّا لَهُ حَقُّ الرَّقَابَةِ عَلٰى أَعْمَالِ السُّلْطَةِ الْعُلْيَا فِي الدَّوْلَةِ وَقَدْ دَعَمَ هٰذِهِ الرَّقَابَةَ بِقَوْلِهِ لَهُمْ أَنْتُمْ شُرَكَائِيْ وَشُهُوْدُ الْمُؤْمِنِيْنَ فَأَشِيْرُوْا عَلَيَّ وَقَدْ أَخَذَ بِمَشُوْرَتِهِمْ وَعَمِلَ بِرَأْيِهِمْ۔ [1]

حضرت عثمانؓ نے اہل مدینہ کی ایک مجلس بنائی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو امت کے سردار اور عمائدین ہیں اور ان ہی میں حضرت عمرؓ کی شوریٰ کے ارکان اور خلافت کے اہل اشخاص شامل تھے اور آپ نے اس مجلس کو سلطنت کے تمام اہم معاملات کی نگرانی کا حق عطا کیا تھا اور آپ نے اس اختیار کو اپنے اس قول سے نہایت قوی کر دیا کہ تم میرے شریک وحصہ دار اور مومنین کے نمائندہ ہو، لہٰذا مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو اور آپ نے ان کے مشورہ کو قبول کیا اور اس پر عمل کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور کے چند نمایاں واقعات کو ہم نے خالص تاریخی رنگ میں آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ان تمام واقعات میں شورائیت پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ فرما نظر آتی ہے۔ ان واقعات میں سے کسی واقعہ پر انگلی رکھ کر یہ نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ یہاں شورائیت مجروح ہوئی ہے، خلیفہ کے انتخاب سے لے کر دیگر

---

[1] عثمانؓ بن عفان ص ۹۹۔

تمام اساسی امور میں جمہوریت کے حسین رُخسار پہ آمریت کی ذرہ برابر پرچھائیں کہیں نظر نہیں آتی ۔

یہ وہ دورِ مسعود ہے جسے ہر مسلمان اپنے لیے نمونۂ عمل قرار دیتا ہے ، اس کے لیے اسوہ صرف خدا کے برگزیدہ رسول کی بے داغ سیرت اور اس کے متبعین کے پاکیزہ کردار میں پنہاں ہے ۔ جب تک انفرادی اور اجتماعی زندگی ان خطوط پر استوار نہیں ہو گی اسے ہم اسلامی زندگی سے تعبیر نہیں کر سکتے ۔

اسلامی ریاست میں امیر کی حیثیت :

مذکورۂ بالا واقعات کی تحقیق و تنقید کے بعد آئیے ان واقعات کی بھی نوعیت متعین کی جائے جن میں خلیفہ نے شوریٰ کی مخالفت کی ہے یا اکثریت کی رائے کو رد کر دیا اور کسی فردِ واحد کے مشورہ پر عمل کیا ہے ۔

ان واقعات کی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ اصول ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اسلامی مملکت کا امیر نہ تو تاج برطانیہ کی طرح بے دست و پا حاکم ہوتا ہے اور نہ اسے مسولینی اور ہٹلر کی طرح آمرِ مطلق کی حیثیت حاصل ہوتی ہے ، اسلام نے اپنے تمام معاملات کی طرح اس میں بھی افراط و تفریط سے ہٹ کر ایک متوسط راہ اختیار کی ہے وہ نہ تو کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ملک و قوم کی جان و مال حوالے کر دیتا ہے کہ جس وقت چاہے قوم کی ہستی کو تہس نہس کر کے رکھ دے اور اس پر گرفت کرنے والی کوئی بالادست طاقت نہ ہو اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ حاکم برائے نام تختِ سلطنت پر بت بنا بیٹھا رہے اور اقتدار کی کنجیاں کسی خاص فرد یا افراد کے ہاتھ میں ہوں ۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ حکومت و اقتدار کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور قانون سازی اور حکمرانی کا حقدار بلا شرکتِ غیرے وہی ہے اور جو گروہ اللہ کے اس اقتدار کو تسلیم کر لیتا ہے ۔ اس گروہ کا ایک ایک فرد اللہ تعالیٰ کے اس حق کا امین اور پاسبان قرار پاتا ہے ، اس امانت کی حفاظت اور نگرانی پوری امت پر عائد ہوتی ہے ، اگر خدانخواستہ یہ امانت ضائع کر دی گئی تو امت کا ہر فرد اصل مالک کے رُوبرُو جواب دہ ہو گا ۔ لیکن چونکہ اجتماعی

نظم کے بغیر ملک و ملت مراحلِ ارتقا طے نہیں کر سکتے بلکہ ان کا وجود بھی ناممکن ہے اس لیے اُمّت پر بحیثیتِ مجموعی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس امانت کو کسی ایسے شخص کے حوالے کرے جو اُمّت کا صالح ترین فرد ہو، جس کی سیرت پر اُمّت کو اعتماد ہو اور جس کے پختہ کردار نے اپنے آپ کو اس عظیم بار کے برداشت کرنے کا اہل ثابت کر دیا ہو تاکہ یہ شخص اُمّت کے اجتماعی کاموں کو اس احساس کے ساتھ سرانجام دے کہ ساری اُمّت جس امانت کی حامل تھی وہ اس کے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے، خدا کے دین کی حفاظت و سربلندی خدا کے بے شمار بندوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی غم خواری و دمسازی کی عظیم ذمہ داریاں امّت نے اس کے حوالے کر دی ہیں اور وہ ان کارہائے نمایاں کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی کرے گا تو مرنے کے بعد اپنے مولیٰ کے حضور جواب دینا پڑے گا اور اس دنیا میں بھی اُمّت کا بچہ بچہ اپنی امانت کے سلسلہ میں اس سے بازپرس کر سکتا ہے اور پوچھ سکتا ہے کہ جن امور میں اُمّت نے تمھیں اپنا معتمد علیہ قرار دیا تھا ان کی کہاں تک تم نے تکمیل کی اور اگر نہیں کی تو کیوں نہیں کی۔

اس تصور سے دو قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ اسلامی ریاست کا صدر ایک ذمہ دار، بااثر اور مقتدر شخص ہوگا، اس کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہوگی کہ اُمّت کو صلاح و فلاح کی راہ پر لے چلے اور ان تمام غلط راہوں پر گامزن ہونے سے باز رکھے جو ہلاکت و تباہی تک منتہی ہونے والے ہیں، بدکردار کو اس کی بدعملی کی سزا دے اور نیکوکار کو اس کے حسنِ عمل کی جزا دے، قوم و ملک پر کوئی آنچ آئے تو اس کی حفاظت کا سامان کرے اور ملک کی ترقی و سربلندی کے اسباب فراہم کرے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قوتِ نافذہ خلیفہ کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کا کام اس کے بغیر انجام نہ پا سکے۔

اس تصور کا دوسرا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی مملکت کا صدر عوام کے رُو برُو جواب دہ ہوگا، اس وجہ سے وہ من مانی کارروائی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی ایسا اقدام کر سکتا ہے جو مملکت کے حق میں ضرر رساں اور تباہ کن ہو، اس لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے

کہ اسلامی مملکت کا صدر داخلی اور خارجی پالیسی، جنگ و صلح اور ایسے ہی ان تمام بنیادی معاملات میں جن کا تعلق مملکت کی بقا و تحفظ سے ہو اور وہ معاملات جو اس کی موت و حیات پر اثر انداز ہو سکتے ہوں بغیر مشورہ کے انجام پائیں اسی وجہ سے مذکورہ بالا مثالوں میں آپ دیکھیں گے کہ خلیفۂ وقت نے اُمّت کی مرضی کو ساتھ لے کر اقدام کیا ہے اور نہ وہ اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرنے کا مجاز ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں خلیفہ پارلیمنٹ کی رائے کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔

ایسے اہم اور اساسی اُمور کے علاوہ دیگر تمام معاملات مثلاً کتاب و سُنّت کے کسی نص کی تشریح و توضیح یا کسی خاص مسئلہ میں اجتہاد و استنباط، کسی سزا کا تعیّن یا کسی جزوی مسئلہ میں مخصوص پہلو کا ترک و اختیار اور ایسے ہی دوسری چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں خلیفہ آزاد ہوگا اور اپنی ذمہ داری پر اقدام عمل کرے گا کیونکہ اس قسم کے مسائل اہم اور اساسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے، ہاں آسانی اور سہولت کے لیے خلیفہ اربابِ فقہ و بصیرت، حالات کے نباض اور ایسے تمام لوگوں سے جنہیں واقعات کا صحیح فہم حاصل ہے مشورہ کرے گا، ایسے تمام معاملات میں خلفائے راشدین کا یہی عمل رہا ہے۔ حدیث و تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ خلفاءُ ان جزئی معاملات میں بھی مشورہ ہی سے کام کرتے تھے۔

ان مشیروں کی حیثیت نمائندگانِ اُمت کی سی نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنی فہم و دانائی اور ژرف نگاہی کے باعث خلیفہ کے مشیر قرار پاتے تھے، جیسے کہ آج کل صدرِ امریکہ کے سیکرٹری ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان مشیروں میں بیشتر اصحاب اپنی فطری صلاحیتوں اور ان پر قوم کے اعتماد کی وجہ سے نمائندگانِ قوم کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ مجھے اکابرِ صحابہ کے برابر جگہ دیتے تھے۔ [1] اور اس کی وجہ حضرت ابنِ عباسؓ کی زیرکی اور فہم و بصیرت تھی جس سے بہت سارے سن رسیدہ لوگ بھی محروم تھے۔

امام بخاریؒ حضرت عمرؓ کے مشیروں کے متعلق لکھتے ہیں:

وَكَانَ الْقُرَّاءُ أَصْحَابَ — قرآن کے عالم حضرت عمرؓ کے مشیر

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۴۰-۵۳۹

مَشُوْرَةِ عُمَرَ كُهُوْلًا	ہوتے تھے خواہ وہ معمر ہوں یا
كَانُوْا أَوْ شُبَّانًا ۔[1]	نوجوان ۔

امام زہریؒ کہتے ہیں:

كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ	حضرت عمرؓ کے سامنے جب کوئی مشکل
إِذَا نَزَلَ الْأَمْرُ الْمُعْضِلُ	مسئلہ پیش آتا تو نوجوانوں کو بلا کر
دَعَا الْفِتْيَانَ فَاسْتَشَارَهُمْ	مشورہ کرتے تاکہ ان کی ذہانت سے
يَبْتَغِي حِدَّةَ عُقُوْلِهِمْ ۔[2]	فائدہ اٹھا سکیں ۔

بغویؒ نے امام زہریؒ کا ایک بیان نقل کیا ہے:

"حضرت عمرؓ کی مجلس ہمیشہ علماء و فقہاء سے کھچا کھچ بھری رہتی تھی جن سے آپ مشورہ طلب امور میں مشورہ کرتے تھے"[3]

ابن سیرینؒ نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ عورتوں سے بھی مشورہ کرتے تھے اور بسا اوقات آپ کو ان کی کسی رائے میں حسن و خوبی کا پہلو نظر آتا تو اسے اختیار فرماتے ۔[4]

حضرت حسن بصریؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی جس طرح مردوں سے مشورہ فرماتے اسی طرح عورتوں سے بھی رائے لیتے اور ان کی رائے درستگی پر مبنی ہوتی تو اسی کو اپناتے[5]

امام ابن تیمیہؒ حضرت عمرؓ کے متعلق لکھتے ہیں:

وَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ	حضرت عمرؓ مختلف معاملات میں صحابہ
يُشَاوِرُ الصَّحَابَةَ رَضِيَ اللّٰهُ	سے مشورہ کرتے تھے ۔ حضرت عثمانؓ ،
عَنْهُمْ فِي الْحَوَادِثِ	علیؓ ، عبدالرحمن بن عوفؓ ، ابن مسعودؓ ،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتصام باب قولہ تعالیٰ وامرہم شوریٰ بینہم الخ [2] السنن الکبریٰ ج ١٠ ص ١١٣ ، مختصر جامع بیان العلم وفضلہ ص ٤٢ ، [3] ازالۃ الخفاء ج ٢ ص ١١٩ ، [4] کنز العمال ج ٢ ص ١٦٣

[5] عیون الاخبار ج ١ ص ٢٧ ،

يُشَاوِرُ عُثْمَانَ وَعَلِيًّا وَعَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ عَوْفٍ وَابْنَ مَسْعُوْدٍ وَزَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ حَتّٰى كَانَ يُشَاوِرُ ابْنَ عَبَّاسٍ.... وَكَانَ يَرْجِعُ تَارَةً اِلٰى رَأْيِ هٰذَا وَتَارَةً اِلٰى رَأْيِ هٰذَا ۔ [1]

زید بن ثابت رضؓ، حتیٰ کہ ابن عباس رضؓ سے بھی مشورہ کرتے کبھی ان کی اور کبھی ان کی رائے اختیار فرماتے۔

لکھتے ہیں حضرت عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور زید بن ثابت رضؓ مسائل میں ایک دوسرے کی طرف مراجعت کرتے تھے، اسی طرح حضرت علی رضؓ، ابی بن کعبؓ اور ابو موسیٰ اشعری رضؓ آپس میں رائے مشورہ کرتے تھے [2]

حضرت عثمان رضؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے رُوبرُو کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو مقدمہ کے ایک فریق سے کہتے، جاؤ علی رضؓ کو بلا لاؤ، دوسرے فریق کو طلحہ رضؓ، زبیر اور بعض دیگر صحابہ کو لے آنے کا حکم دیتے۔ ان افراد کے جمع ہو جانے کے بعد فریقین کو مقدمہ پیش کرنے کا حکم دیتے، مقدمہ سنائے جانے کے بعد ان بزرگوں کی رائے دریافت فرماتے۔ اگر ان حضرات کی رائے اپنی رائے کے موافق پاتے تو اسی وقت فیصلہ فرما دیتے ورنہ ان آراء کی روشنی میں غور کر کے فیصلہ کرتے ۔ [3]

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں دو مختلف قسم کے ایوان ہوتے تھے۔ ایک ایوانِ عام جس میں مہاجرین و انصار کے نمائندے جمع ہو کر فیصلہ کن معاملات اور اہم سیاسی امور پر غور کرتے، اِس ایوان کے اجلاس ایسے ہی اوقات میں منعقد ہوتے جب کہ کسی اہم اور بنیادی معاملہ کو زیرِ بحث لانا مقصود ہوتا، اس ایوان میں جب کسی رائے پر اجماع ہو جاتا تو امیر اس کے خلاف اقدام نہیں کر سکتا تھا، روزمرّہ کے مسائل میں ایوانِ خاص منعقد ہوتا تھا جس کے مشوروں کی پابندی امام پر لازم نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ مسائل کے حل کرنے کا یہ ایک فطری طریقہ ہے اس لیے اس کی پابندی کی جاتی تھی اور آج

---

[1] منہاج السنۃ ج ۳ صـ ۱۵۰ [2] اعلام الموقعین ج ۱ صـ ۲۱۲

[3] السنن الکبریٰ ج ۱۰ صـ ۱۱۲ ۔

بھی پابندی کی جانی چاہیئے۔ کتبِ حدیث و تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ دورِ اوّل میں نہ صرف خلفائے راشدین بلکہ عام صحابۂ کرام رضی کے درمیان بھی اس کا رواج تھا۔

مسیب بن رافع کہتے ہیں کہ جس مسئلہ میں صحابہ کرام کو کتاب و سنّت کی واضح تعلیم نہ ملتی تو آپس میں جمع ہو کر مشورہ کرتے اور کسی نتیجہ پر پہنچتے، جس امر پر ان کا اجماع ہو جائے وہی حق ہے۔[1]

قسمؒ تابعی سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا، جواب دیا گیا کہ نہ تو میں اس مسئلہ میں مشورہ کرنے پر مجبور ہوں اور نہ میرے ذہن میں اس کا کوئی جواب ہے۔[2]

اس قسم کے مشاورتِ باہمی کی ایک مثال صحابہ کے دور سے اس وقت پیش کی جاتی ہے۔

ابو مسلم خولانیؒ کہتے ہیں:

> ”ایک مرتبہ میں دمشق کی مسجد میں گیا، دیکھا کہ معمر صحابہ کا ایک حلقہ لگا ہوا ہے اور اسی مجلس میں سرگیں آنکھوں اور چمک دار دانتوں والا ایک نوجوان بھی بیٹھا ہوا ہے اور اس مجلس میں مسائل زیرِ بحث آتے جاتے ہیں، جب کسی مسئلہ میں ان بزرگوں کے مابین اختلاف ہوتا تو سب اس نوجوان کی طرف رجوع کرتے، اس نوجوان کے متعلق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مشہور صحابی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔“

خلفاء کے اس دوسرے ایوان کی بالکل یہی حیثیت ہوتی تھی۔ اب ہم اس قسم کے چند واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ہر شخص بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایوانِ خاص میں حل کیے جانے والے مسائل اور ایوانِ عام میں زیرِ بحث آمدہ مسائل (جن کی مثالیں صفحاتِ بالا میں پیش کی جا چکی ہیں) میں نوعیت کا کتنا عظیم الشان فرق ہے۔

(۱) سب سے پہلے چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے

---

[1] سنن دارمی ص۲۸ باب التورع عن الجواب فیما لیس فیہ کتاب والاسنۃ ، الاعتصام للشاطبی ج ۳ ص۱۳۷ امام شاطبی کے نقل کردہ الفاظ سنن دارمی کے الفاظ سے مختلف ہیں البتہ مفہوم ایک ہے۔

[2] سنن دارمی ص۲۸

[3] مسند احمد ج ۵ ص۲۳۲۔

کہ جزئی معاملات میں بھی مشیروں کے مشوروں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی اور جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو انہیں ردّ نہ کیا جاتا تھا۔

جمع قرآن:

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن کے مختلف اجزاء جو مختلف صحیفوں اور حفاظِ قرآن کے سینوں میں محفوظ ہیں انہیں تحریری شکل میں یکجا کر لیا جائے۔ ابتدا میں حضرت ابوبکرؓ نے کچھ پس و پیش کیا۔ لیکن بعد میں ان پر حضرت عمرؓ کے مشورہ کی عظمت واضح ہو گئی اور قرآن کو ایک نسخہ میں جمع کروا دیا۔ [1]

حضرت عثمانؓ کے دور تک یکجا مرتب شکل میں قرآن مجید کا صرف ایک نسخہ تھا۔ حضرت حذیفہؓ نے حضرت عثمانؓ کو مشورہ دیا کہ اس کے متعدد نسخے نقل کروا کر متعدد ممالک میں بھیج دیے جائیں۔ تاکہ صحیح نسخوں کی کمی کے باعث قرآن غلط سلط پڑھنے سے لوگ محفوظ رہ سکیں۔ حضرت عثمانؓ نے اس مشورہ کو قبول کیا اور پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی کے حوالے یہ کام کیا کہ قرآن کے متعدّد نسخے تیار کرے۔ [2]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اس سلسلہ میں حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ سے بھی مشورہ کیا تھا۔ [3]

لوطی کی سزا:

حضرت خالدؓ کے سامنے ایک شخص کو لواطت کے جرم میں گرفتار کر کے پیش کیا گیا چونکہ کتاب و سنت میں اس جرم کی کوئی متعین سزا موجود نہیں ہے اس لیے حضرت خالدؓ نے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکرؓ کی طرف مراجعت کی، حضرت ابوبکرؓ نے مسئلہ کو اپنے مشیروں کے سامنے پیش کیا اور اپنی ذاتی رائے کی بھی تصریح کر دی کہ لوطی کو قتل کی سزا دی جانی چاہیئے، مشیروں نے اس رائے کی ہمنوائی کی ہی تھی کہ اتنے میں حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ خلافِ فطرت اور

---

[1] صحیح بخاری باب جمع القرآن

[2] صحیح بخاری باب جمع القرآن

[3] فتح الباری ج ۱۳ صہ ۲۶۳۔

مکروہ فعل صرف قتل ہی کا مستحق نہیں ہے بلکہ اس کی سزا سخت ترین اور عبرت ناک ہونی چاہیئے تاکہ پھر کسی کو اقدام کی ہمت نہ ہو، عرب مثلہ کی سزا کو سب سے گھناؤنی سزا اور جبین انسانیت پر ایک بدنما داغ سمجھتے ہیں اس فعل شنیع پر کوئی ایسی سزا تجویز کی جائے جو مثلہ سے بھی زیادہ معیوب ہو اور میری رائے میں اس فعل شنیع کے مرتکب کو نظر آتش فروزاں کر دیا جائے حضرت ابوبکرؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی کے مطابق حد جاری کرنے کا حضرت خالدؓ کو حکم دیا[1]

امیر المومنین کا لقب :

گورنر عراق نے دو عراقیوں کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجا ان لوگوں نے حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لقب کے سننے کے بعد حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ خلیفہ کا کوئی سرکاری لقب ہونا چاہیئے جس سے وہ یاد کیا جائے ورنہ اگر پہلے خلیفہ کو خلیفۂ رسول کہا جائے اور دوسرے کو خلیفۂ خلیفۂ رسول تو یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہم مومنین ہیں اور آپ ہمارے امیر۔ لہٰذا آپ کو امیر المومنین کہا جائے، اسی وقت سے حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا جانے لگا[2]

خلیفہ کی تنخواہ :

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ اور دیگر اکابر قوم سے دریافت کیا کہ خلیفہ بیت المال سے تنخواہ لے سکتا ہے یا نہیں ؟ اور اگر لے سکتا ہے تو کس قدر ؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ آپ اپنے لیے اور اپنے ان تمام اہل وعیال کے لیے جن کی کفالت کا بار آپ پر ہے معروف

---

[1] لابن حزم ج ۱۱ ص ۳۸۱-۳۸۰ ،

[2] ابن عبدالبر نے استیعاب میں دو قسم کی روایتیں نقل کی ہیں جن میں ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ عراقیوں کے کہنے کے بعد یہ لقب اختیار کیا گیا اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشورے سے اسے اختیار کیا گیا ہم نے مذکورہ بالا طریقہ سے دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق دی ہے۔ ابن سعد کی روایت سے مجملاً اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنین کا لقب مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے اختیار کیا گیا۔ ابن سعد ج ۳ ص ۲۰۲ ۔

طریقہ سے تنخواہ لے سکتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا یہ مال جو پوری قوم کی ملکیت ہے اسے کس طرح میں اپنے ذاتی اخراجات میں لا سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ "چونکہ قوم ہی کے مفاد کے لیے آپ اپنے حصولِ رزق سے باز آ گئے ہیں بلکہ اجتماعی مصروفیات نے کسبِ رزق سے باز رکھا ہے اس لیے آپ کو اس مال سے معروف طریقہ پر مستفید ہونے کا حق ہے[1]

عارضی زکوٰۃ :

شام کے کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ بہت سارے گھوڑے، غلام اور مختلف قسم کے اموال ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان سے "زکوٰۃ" وصول کی جائے تاکہ ہمارا مال پاک ہو۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ زکوٰۃ ایک دینی فریضہ ہے اور اس کے وصول کرنے کے لیے چند خاص شرائط ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم کا کوئی شخص مجاز نہیں ہے۔ تم جس قسم کی "زکوٰۃ" دینا چاہتے ہو اس کا ثبوت آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے دور میں نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا مجھے اس کے قبول کرنے میں تامل ہے"۔

آپ نے اس سوال کو اپنی شوریٰ میں پیش کیا حضرت علیؓ نے جواب دیا اگر اس "زکوٰۃ" کی نوعیت مستقل ٹیکس کی نہیں ہے اور یہ لوگ برضا و رغبت زکوٰۃ کی تعداد کے لحاظ سے کچھ مال اللہ کی راہ میں دینا چاہتے ہیں تو اس میں تامل کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ کے بعد آنے والے بھی اس پر عمل کر سکتے ہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

بیرونی اموال پر ٹیکس :

منبج کا علاقہ دارالحرب میں شامل تھا وہاں کے باشندوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ہم آپ کے ملک میں تجارت کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو دس فیصد ٹیکس ادا کرنے کے لیے تیار

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۱۷، اس سلسلہ میں بعض اور بیانات بھی ملتے ہیں۔

[2] مسند احمد حدیث نمبر

ہیں۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور ان کی پسندیدگی کے بعد اسے قانونی شکل دے دی۔[1]

غلاموں کی رہائی:

فتح عراق کے بعد وہاں کے قیدیوں کو حضرت عمرؓ اسلامی فوج کے درمیان تقسیم کر دینا چاہتے تھے۔ حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ انہیں غلام بنائے رکھنے کے بجائے آزاد کر دیا جائے اور ان سے جزیہ وصول کیا جاتا رہے۔ اس مملکت کو مستقل فائدہ پہنچے گا۔ حضرت عمرؓ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اختیار کیا۔[2]

شراب کی حد:

قرآن وحدیث میں جرم مے خواری کے لیے کوئی متعین سزا نہیں بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کبھی چالیس کوڑے لگائے جاتے تھے اور کبھی یوں ہی زدوکوب کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔[3] حضرت عمرؓ نے چاہا کہ سرکاری طور پر اس کی ایک خاص حد مقرر کر دی جائے۔ آپ نے اہلِ علم صحابہ کی مجلس .... میں یہ مسئلہ پیش کیا، اس مجلس کے شرکاء میں حضرت علی، طلحہ، زبیر اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ہمیں متعین طور پر ملتے ہیں۔[4] غالباً سب نے حضرت عمرؓ کی رائے کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد سزا کے تعین پر بحث ہوئی۔ حضرت علیؓ نے کہا آدمی جب نشۂ شراب سے بدمست ہو جاتا ہے تو اول فول بکنے لگتا ہے اور عموماً دوسروں کی آبروریزی بھی کر بیٹھتا ہے۔ لہٰذا شارب کی سزا قاذف ہی کی سزا ہونی چاہیے جو قرآن کی رو سے اسی کوڑے ہے۔[5] حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا کہ میری رائے میں بھی شرابی کی یہی حد ہونا چاہیے کیونکہ قرآن مجید نے سب سے کم تہمت کی سزا رکھی ہے۔ لہٰذا شراب کی حد خدا کے متعین کردہ حدود میں سب سے ہلکی رہے

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۶۲-۱۶۱

[2] کتاب الخراج ص ۶۳

[3] ابوداؤد ج ۲ کتاب الحدود باب فی الحد فی الخمر

[4] اعلام الموقعین

[5] موطا امام مالک کتاب الاشربہ باب الحد فی الخمر

(کیونکہ اجتہاد میں حتی الوسع احتیاط برتنی چاہیئے تاکہ کہیں کسی پر ظلم نہ ہونے پائے) چنانچہ اسی کے مطابق فیصلہ ہوا۔ [1]

تشریع اذان:

ہجرتِ مدینہ کے بعد نماز باجماعت کا حکم نازل ہوا لیکن نماز کے اوقات کے اعلان کی کوئی صورت نہیں تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا، بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ آگ جلائی جائے تاکہ لوگ اس کی روشنی کو دیکھ کر جمع ہو سکیں، بعض دیگر اصحاب نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے لیکن پہلی صورت میں آتش پرستوں سے اور دوسری صورت میں اہلِ کتاب سے مشابہت پائی جاتی تھی اس لیے اُن مشوروں کو پسند نہیں کیا گیا۔ دوسرے دن عبداللہ بن زیدؓ نے حضورؐ سے کہا کہ مجھے خواب میں نمازیوں کو وقت پر جمع کرانے کی ایک نئی صورت (اذان کی موجودہ شکل) بتائی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن زیدؓ کی دیکھی ہوئی شکل کو پسند فرمایا اور فرمایا کہ حضرت بلالؓ کو سکھا دی جائے تاکہ وہ زور سے اذان دے سکیں۔ حضرت عمرؓ نے بعد میں کہا کہ بعینہٖ یہی خواب انہوں نے بھی دیکھا۔ [2]

تعریضاً قذف کی سزا:

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دو شخص کسی بات پر اُلجھ پڑے اور سب و شتم تک نوبت پہنچ گئی۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے دوسرے سے کہا میرا باپ زانی ہے نہ میری ماں، گویا قائل نے اس تعریض کے ذریعہ اپنے حریف کے ماں باپ کے زانی ہونے کی تہمت لگائی۔ حضرت عمرؓ کے روبرو یہ مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ بعض صحابہ نے کہا کہ قائل نے صرف اپنے ماں باپ کی تعریف کی اتنی سی بات سے کسی دوسرے کا زانی ہونا واضح طور پر ثابت نہیں ہوتا جب تک جرم واضح طور پر ثابت نہ ہو سزا نہیں دی جا سکتی لیکن بعض دوسرے صحابہ نے کہا کہ اس موقع و محل میں قائل کے مذکورہ بالا جملہ کا مقصود اپنے حریف کے والدین پر تہمت طرازی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس پر حدِ قذف جاری ہونی چاہیئے۔ حضرت

---

[1] ابوداؤد، کتاب الحدود باب فی الحد فی الخمر

[2] مشکوٰۃ باب الاذان۔

عمرؓ نے دوسری رائے کو پسند کیا اور قائل کو اسّی کوڑے لگوائے[1]

سن ہجری کا آغاز :

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں ضرورت محسوس کی کہ کوئی ایسا دن مقرر کیا جائے جس سے مسلمان اپنی تاریخ متعین کر سکیں۔ آپ نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا۔ مختلف بزرگوں نے مختلف مشورے دیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ جس دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دار الشرک کو چھوڑ کر مدینہ تشریف لے آئے اور اسلام کو ایک نئی زندگی نصیب ہوئی، اسی دن سے تاریخ شروع کی جائے، حضرت عمرؓ نے اس مشورہ کو قبول فرمایا اور اسی تاریخ کو اسلامی تاریخ کا پہلا دن مقرر کیا[2]

(۳) اب ہم چند ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ بعض اوقات خلیفہ نے اکثریت کی رائے کے مقابلہ میں کسی ایک فرد کی رائے کو زیادہ قوی پاکر ترجیح دی ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک حاملہ کو غالباً کسی جرم پر سزا دینے کے لیے طلب کیا۔ سزا کے خوف سے عورت کا حمل ساقط ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عثمانؓ نے کہا کہ آپ اس کی تادیب و اصلاح چاہتے تھے اور اس حادثہ میں آپ کے قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ لہٰذا ہم آپ کو ہر قسم کی ذمہ داری سے بری سمجھتے ہیں حضرت علیؓ کی رائے اس کے خلاف تھی۔ فرمایا ممکن ہے آپ کو گناہ نہ ہو کیونکہ آپ کی نیت نیک تھی لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دیت ادا کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ کو پسند کیا اور اس پر عمل کیا[3]

ایک عورت حضرت عمرؓ کی عدالت میں حاضر ہوئی اور جرم زنا کا اقرار کیا۔ حضرت عمرؓ کے پاس جو صحابہ موجود تھے انہوں نے حد کے جاری کرنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عثمانؓ اسی مجلس میں اپنی جگہ خاموش تھے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ عثمانؓ! آپ کیوں خاموش ہیں؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ اس

---

[1] مؤطا امام مالک کتاب الحدود باب الحد فی القذف والنفی والتعریض [2] مستدرک حاکم ج ۳ صہ ۱۴، تاریخ طبری ج ۳۵۲ [3] اعلام الموقعین ج ۱ صہ ۱۸۷۔

عورت کے برملا اقرار سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ یہ حرمتِ زنا اور اس کی بھیانک سزا سے واقف نہیں ہے۔ عورت سے دریافت کرنے پر یہی صورت نکلی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے مشورے کے مطابق عورت کو معافی کا پروانہ عطا کیا۔[1]

(۴) ذیل میں ہم دو چار ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جو جزئی مسائل میں امام کے اختیارِ کامل پر صاف صاف دلالت کرتے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ نے شوریٰ کی رائے کے مقابلہ میں اپنی ہی رائے کو قابلِ عمل سمجھا اور اس پر عمل کیا ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ کی بعض فروگذاشتوں پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کی معزولی کا مشورہ دیا اور بار بار اپنی رائے کو دہراتے رہے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورہ کو نہیں مانا اور خالدؓ پورے دورِ صدیقی میں اپنے منصب پر قائم رہے۔[2]

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن سعید بن العاص کو کمانڈر مقرر کرنا چاہا چونکہ ابنِ سعیدؓ نے ایک موقع پر بعض نامناسب خیالات کا اظہار کر دیا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس سے باز رکھنے کی سعی کی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے کے باوجود انہیں کمانڈر مقرر کیا۔[3]

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ صحابہ سے مشورہ کیا کہ میّت کے ترکہ کے زیادہ حقدار اس کے بھائی ہیں یا اس کے دادا جب کہ باپ نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی ذاتی رائے میں دادا باپ کا قائمقام تھا اس لیے آپ نے بھائیوں کی نسبت اسے زیادہ حقدار قرار دیا۔ لیکن زید بن ثابتؓ، حضرت علیؓ اور ابنِ عباسؓ کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ان بزرگوں کے نزدیک میّت کے ترکہ کے دادا کی نسبت بھائی زیادہ حقدار تھے۔ (گو کہ حضرت علیؓ اور زید بن ثابتؓ کی آراء آپس میں

---

[1] منہاج السنۃ ج ۳ صـ ۱۶۳

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ صـ ۳۔

ذرا سی مختلف تھیں) زید بن ثابتؓ نے مختلف تمثیلوں کے ذریعہ اپنی رائے کی حقیقت واضح کرنے کی سعی کی اور کہا کہ ایک درخت کی ٹہنی سے جب دو شاخیں نکلتی ہیں تو یہ شاخیں اس ٹہنی سے بہ نسبت اصل پیڑ کے زیادہ قریب ہوتی ہیں لیکن حضرت عمرؓ نے ان دلائل کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر آج مجھے فیصلہ کرنا پڑا تو دادا ہی کے حق میں فیصلہ کروں گا۔

حضرت عمرؓ کو جب ابو لؤلؤ نامی ایک غلام نے شہید کر ڈالا تو جوشِ غضب میں آپ کے فرزند عبید اللہ نے قاتل کے ساتھ بعض دیگر مشتبہ لوگوں کا بھی کام تمام کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے مسند آرائے خلافت ہونے کے بعد سب سے پہلے یہی مقدمہ پیش ہوا۔ چونکہ قاتل کے قتل کرنے کا حضرت عبید اللہ کو کوئی حق نہیں تھا اور ساتھ ہی انہوں نے غیر قاتلین کو بھی قتل کر دیا تھا اس وجہ سے بعض صحابہ نے قصاص میں عبید اللہ کے قتل کا مشورہ دیا۔ بعض دیگر صحابہ نے کہا چونکہ عبید اللہ سے یہ حرکت شدتِ غم اور بے اختیاری کے عالم میں سرزد ہوئی ہے اس لیے انہیں معاف کر دیا جائے۔ حضرت عمروؓ بن العاصؓ نے ان تینوں رایوں میں سے کسی کو بھی قبول نہیں کیا بلکہ اپنے مال سے مقتول کی دیت ادا کی[1]

اس قسم کے بعض اور واقعات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ واقعات حد درجہ جزئی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت فقہی مسائل کی سی ہے جن میں ایک سے زیادہ آراء کا پایا جانا معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے اور ہر شخص اپنی رائے پر بخوشی قائم رہ سکتا ہے اور دوسروں کے سامنے اپنی رائے کی صحت پر دلائل بھی پیش کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے دلائل سے مطمئن ہو جائے گا تو اس کی ہمنوائی کرے گا لیکن جو مطمئن نہ ہو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ان فقہی مسائل میں جس طرح خلفاء اپنے مشیروں کی رائے کے پابند نہیں ہوتے تھے بالکل اسی طرح عوام بھی خلفاء کی رائے و مسلک پر اتباع پر مجبور نہیں تھے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہمیں اسلام کے ابتدائی عہد میں ملتی ہیں لیکن جیسا کہ ہم صراحت کر چکے ہیں کہ خلفائے راشدین کے دور، خصوصیت سے حضرت ابوبکرؓ و

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، صـ ۱۴۹-۱۴۸۔

عمرؓ کے دَور میں یہ جزئی مسائل بھی عام طور پر شوریٰ ہی کے ذریعہ طے پاتے تھے اور جو مسائل باہمی مشورہ کے ذریعے طے کیے جائیں انفرادی آراء کے مقابلہ میں اس کی حیثیت بہت ہی ارفع واعلیٰ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ قرآن وسُنّت میں دلیل نہ پانے پر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دَور سے دلیل اخذ کرتے تھے۔

اسلام کے قانونِ شوریٰ کی یہ تفصیلی کیفیت ہے جو کتاب وسُنّت کے اوراق میں ہمیں ملتی ہے اور حاملینِ کتاب وسُنّت کی زندگیاں جس کی تصدیق کرتی ہیں۔

Institute of Islamic Studies
LIBRARY
Panjab University Lahore.

ہماری چند اہم مطبوعات

قرآن فہمی کے بنیادی اصول	سید ابوالاعلیٰ مودودی
ارشادات رسول	عبدالرحیم اشرف
سنت نبوی ؐ	حافظ ابوسعید ندوی
حسن اعداء	ابوالقاسم رفیق دلاوری
سیرت المختار	شیخ مصطفےٰ الغلایینی
عرب کا چاند	سوامی لکشمن پرشاد
سید البشر (دو حصص)	قاضی سلیمان منصورپوری
رسول ؐ اور سنت رسول ؐ	نعیم صدیقی
اذکار آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد
اللہ کی بادشاہت	پرنس سعید حلیم پاشا
قربانی کی حقیقت اور اس کی تاریخ	مترجم امین احسن اصلاحی
تحریک مجاہدین	اسعد گیلانی
تصویریں	"
آدم کے تین بیٹے	"
خطرناک راہیں	اصغر علی عابدی
امام احمد بن حنبل	نصر اللہ خان عزیز

مکتبہ تعمیر انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور